سہ ماہی

ایجوکیشنل ٹائمز

ناگپور

13 | 14

78

بیاد محمد علی جوہر

زیر اہتمام

انجمن ادب ہند ناگپور مہاراشٹر

عرق النسا

SCIATICA کا तिडकयावात

تیر بہدف علاج

ایک اللہ والے کا عطیہ — ایک اسراری نسخہ

طریقِ استعمال • ایک گولی ٹھنڈے پانی سے سوتے وقت

• پرہیز •

دوران علاج سبزیوں میں آلو، گوبھی، بیگن اور دالوں میں چنا، مسور، اڑد دال بالکل استعمال نہ کریں۔ علاوہ ازیں چاول، گڑ، اور ہر قسم کے کھٹے سے قطعی پرہیز کریں۔ بفضلِ ربّی شفائے کلی ہوگی

علاج کے لئے رابطہ قائم کریں

ماہر امراض حفیہ ڈاکٹر ایم اے۔ میر

نیو لائف ڈسپنسری صرافہ بازار، ٹانگہ اسٹینڈ چوک اتواری ناگپور ۲

Phone • اوقات مطب • 40784

روزانہ صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک — شام ۶ بجے سے ۹ بجے تک

اتوار — ۹ بجے سے ایک بجے دن تک
شام ۵ بجے سے ۸ بجے شب تک

جاری شدہ ۱۹۷۵ء

تعلیم ادب تہذیب اور قومی یکجہتی کا ترجمان

سہ ماہی ایجوکیشنل ٹائمز ناگپور

جلد ۴ سنہ ۱۹۷۹ء

شمارہ ۲۱

مدیر اعلیٰ
قادر نیازی

مدیر
محمد خضر حیات
ایم اے، بی ایڈ

معاون مدیرہ
کلثوم ممتاز

سرکولیشن منیجر
جمال الدین برق

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ پچاس پیسے
زر سالانہ : چھ روپے
ممالک غیر سے : ایک پونڈ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
سہ ماہی ایجوکیشنل ٹائمز گانجہ کھیت ناگپور ۱۸
مہاراشٹر۔ پن ۴۴۰۰۱۸

مشمولات

شوخی اور زندہ دلی

سید ہاشمی فرید آبادی

زندہ دلی اور شوخی محمد علی کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔ ابھی چند روز ہوئے لندن سے میرے ایک دوست کا خط آیا ہے۔ انھوں نے محمد علی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شملہ کی ایک دعوت میں محمد علی بھی مدعو تھے۔ حاضرین تمام اونچے اور سرکاری طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد علی بھی اپنے فقیرانہ لباس میں ایک ملّائے مسجد کی طرح رونق افروز تھے۔ اور اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی بات میں الجھ کر انھوں نے انگریزی شروع کر دی۔ اب کون ان کے سامنے ٹک سکتا تھا۔

میز پر کوئی ہندوستانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان سے رہا نہ گیا۔ پوچھ بیٹھیں۔

"آپ نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی؟"

محمد علی نے جواب دیا "میں نے انگریزی کی تحصیل ایک معمولی سے قصبے میں کی ہے"۔

خاتون نے جوش اشتیاق سے بے تاب ہو کر پوچھا "کیا نام ہے اس قصبے کا؟"

محمد علی نے نہایت سادگی سے جواب دیا "آکسفورڈ"۔

ساری محفل کشتِ زارِ زعفران بن گئی۔

اپنی بات

قصر ایک بلندی پر

ایجوکیشنل ٹائمز کا محمد علی جوہر نمبر کیوں؟ اور پھر یہ نمبر وغیرہ کا چکر کیوں؟ ابھی تو ایجوکیشنل ٹائمز کی بنیادیں مضبوط کرنے کا کام باقی ہے۔ ابھی تو اس چھوٹے سے پودے کی پرورش و پرداخت کا سخت صبر آزما کام مرحلۂ تکمیل تک پہنچنا باقی ہے اور پھر کہاں محمد علی جوہر کی عبقری و عہد ساز شخصیت اور کہاں ایجوکیشنل ٹائمز کے محدود وسائل و ذرائع ابھی بھی ہمارے کرم فرمانے توجہ دلائی کہ جوہر صدی کے اس سال میں اردو کے بیشتر پرچے محمد علی جوہر کی یاد میں خصوصی ضمیمے نکال رہے ہیں "ایجوکیشنل ٹائمز کیوں نہ نکالے؟ بات کچھ جچی۔ وسائل کی کمی اور ذرائع کا فقدان خوف بن کر آڑے آئے۔ لیکن شاید یہ جوہر کی بے باکی اور بے خوفی کا ایک غیر محسوس فیض تھا کہ دل نے ایک فیصلۂ رندانہ کر لینے کی جرأت کر ڈالی۔ کام مشکل تھا اور اسی دوران جب "آج کل" اور "جامعہ" جیسے معیاری پرچوں کی خصوصی اشاعتیں دیکھنے کو ملیں تو اور بھی مشکل نظر آنے لگا۔ مگر پھر خیال آیا کہ محمد علی جوہر اور ناگپور کا کچھ ایسا تعلق ہے کہ اس علاقہ سے شائع ہونے والے اس واحد جریدے میں اگر محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش نہ کیا گیا تو ہمارے لئے یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ اس لئے اس شمارے کو ہم نے جوہر نمبر کی حیثیت سے ہی پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اس کے حسن و قبح کے متعلق ہم آپ کی آراء کے منتظر ہیں۔

یہ شمارہ چوتھے سال کا پہلا اور دوسرا شمارہ ہے۔ پرچے کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کو ختم کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ ہم اس شمارے کو دو سہ ماہیوں کی مشترکہ اشاعت کی صورت میں پیش کریں۔ باوجود کوشش کے کتابت کی دشواریوں کی وجہ سے ہم اس مشترکہ خصوصی اشاعت کو بھی بروقت شائع کرنے سے قاصر رہے۔ لیکن حوصلوں کی بلندی ہمیں مایوسی کے دلدل میں پھنسنے سے بچاتی ہے اس لئے ادارہ پر امید ہے کہ چوتھے سال کا تیسرا شمارہ وسط ستمبر تک شائع کرکے ہم اس تاخیر کو بھی ختم کر سکیں گے۔

سالانہ خریدار حضرات اطمینان رکھیں کہ انھیں اس مشترکہ اشاعت سے کوئی نقصان نہیں ہوگا ان کے حساب میں اسے ایک ہی شمارہ تصور کیا جائے گا۔

ہم مشکور و ممنون ہیں ان تمام قلمی معاونین کے اور مشتہرین و نیز تمام ہمدردوں کے جن کی حوصلہ افزائی ہمیں مایوسیوں سے بچاتی اور اگلی منزلوں تک بڑھنے کو اکساتی ہے۔ ●●●

مدیر

انجمن ادبِ ہند ناگپور

کے

جدید انتخابات

انجمن ادب ہند ناگپور شہر ناگپور کی وہ واحد ادبی انجمن ہے جو گذشتہ ۳ سال سے اپنی نگرانی میں ایجوکیشنل ٹائمز کو شائع کر رہی ہے۔ گذشتہ ۲ جون ۸۹ء کو محترم ڈاکٹر ایم اے میر کے دولتکدہ پر انجمن کی ایک انتخابی میٹنگ ہوئی جس میں درجِ ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر	جناب ڈاکٹر ایم اے میر
نائب صدور	جناب جمال الدین برق اور جناب شریف اورنگ صاحب
سکریٹری	جناب قادر نیازی
جوائنٹ سکریٹریز	جناب یوسف راز اور جناب ڈاکٹر شہزاد قادری
پروپیگنڈہ سکریٹری	جناب محمد خضر حیات
ممبرانِ مجلسِ منتظمہ	۱۔ جناب پھول چند ناگپور ۲۔ جناب انوپ کمار " ۳۔ محترمہ کلثوم ممتاز " ۴۔ جناب منہاج الحسن " ۵۔ جناب شمیم صادق ۶۔ جناب خورشید علی نظمی بھلائی ۷۔ جناب فیروز کمال انصاری جلپور ۸۔ جناب ایم اے خانصاحب ناگپور

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ مردِ مومن

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمئ محفل ہے وہ

اقبال

علی برادران کی اسیری

۲۸ دسمبر ۱۹۲۹ء کو پانچ سال کی نظر بندی کے بعد علی برادران جب رہا ہو کر بیتول جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے۔ جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا تو علامہ اقبال مولانا محمد علی کے استقبال کے لئے بطور خاص امرتسر گئے اور یہ نظم مسلم لیگ کے اجلاس میں ترنم کے ساتھ سنائی جس نے حاضرین پر سکتے کا عالم طاری کر دیا۔ یہ نظم "بانگ درا" میں اسیری کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

طرفہ قریشی

مومن پورہ ناگپور

رئیس الاحرار

نغمہ پرداز سیاست اے نفیر حریت
تیری نے کا زیروبم تھا آشنائے مملکت

تیرے ہر جملے میں روشن تھا سیاست کا چراغ
تجھ کو قدرت نے دیا تھا اہل یورپ کا دماغ

تو ملا سکتا تھا آنکھیں برق شعلہ بار سے
آگ بجھ سکتی تھی تری گرمیٔ گفتار سے

تیرے ہر فقرے میں پنہاں تھے ہزاروں انقلاب
تو الٹ سکتا تھا آزادی کے چہرے سے نقاب

جادہ پیمائے صداقت تھا ترا عزم جواں
قوم تیری کارواں تھی اور تو میرِ کارواں

دوڑتا آیا زمانہ تیری اک آواز پر
گیت آزادی کے گایا مملکت کے ساز پر

تھیں فلاحِ قوم کی راہیں ترے پیشِ نظر
تو نکل آیا تھا باطل کی صفوں کو چیر کر

دیوِ استبداد کو نیچا دکھا سکتا تھا تو
آدمی کیا شیر سے پنجے لڑا سکتا تھا تو

تیری تقریروں میں تھا پہلو نئی تعمیر کا
آج بھی محبوب ہے تو ہر جوان و پیر کا

خدمت خلق خدا میں تیرے اٹھے تھے قدم
اپنے نقش پا پہ رکھی تو نے بنیادِ حرم

جادہ پیمائے فلاح قوم تھی تیری نظر
رکھ دیا تھا قوم نے سر اپنا تیرے پاؤں پر

دینے والے قوم کو ترغیبِ آزادیٔ ملک
کیوں نہ ہوتی کامراں تحریکِ آزادیٔ ملک

تو نے جس آئین پر رکھی تھی بنیادِ یقیں
کھو دیا اب قوم نے وہ اعتماد دلنشیں

کس طرح ہو دور اب یہ انتشارِ بزمِ قوم
ہاتھ میں اب کوئی کیسے عنانِ عزمِ قوم

کس طرح حاصل ہو عالمگیر ہم کو تمکنت
کون ہوگا اب سر آرائے بزمِ سلطنت

جس کے دل میں قوم کا ہو تہ جذبہ جاگزیں
کھینچ لیتی ہے اسے بیت المقدس کی زمیں

محبوب راہی

نزد گلزار مسجد پوسٹ بارسی ٹاکلی۔ آکولہ۔

محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

وہ کہ ہم سب کے لئے تھا موجبِ صد افتخار
وہ کہ جوہر جس کے تھے سارے جہاں پر آشکار
وہ کہ تھا میدانِ کردار و عمل کا شہسوار
وہ کہ وابستہ تھا جس کے دم سے بھارت کا وقار

وہ کہ جس کا نام تابندہ رہے گا حشر تک
زندہ تھا زندہ ہے وہ زندہ رہے گا حشر تک

جس نے تحریکِ خلافت کو عطا کی زندگی
جس نے مردہ قوم میں اک روح تازہ پھونک دی
جس نے بنیادیں ہلا دیں قصرِ استبداد کی
جس نے کی بھارت کے سارے رہبروں کی رہبری

جس نے بتلایا کہ یوں جیتے ہیں اربابِ وفا
ساغرِ زہراب یوں پیتے ہیں اربابِ وفا

مخزنِ فہم و تدبر صاحبِ ادراک تھا
جیسا ظاہر پاک تھا باطن بھی اس کا پاک تھا
دوسروں جیسا نہ ہرگز شاطر و چالاک تھا
وہ نڈر تھا حق نوا تھا صاف گو بیباک تھا

بات جب اظہارِ حق کی آئے تو ڈرتا نہ تھا
پیروی وہ چاپلوسوں کی کبھی کرتا نہ تھا

جذبۂ ایثار تھا خوئے صداقت اس میں تھی
راہِ حق پہ جاں لٹا دینے کی جرأت اس میں تھی
غم کی چٹانوں سے ٹکرانے کی طاقت اس میں تھی
حوصلہ تھا ولولہ تھا عزم و ہمت اس میں تھی

دشمنوں میں کو د پڑتا تھا دلیروں کی طرح
ہر گھڑی للکارتا رہتا تھا شیروں کی طرح

اپنے ہاتھوں میں اٹھائے تھا نشانِ حریت
تھی فزوں تر آن اسی کے دم سے شانِ حریت
روح تھا وہ حریت کی وہ تھا جانِ حریت
تھا حقیقت میں وہی اک پاسبانِ حریت

مسلکِ حق و صداقت کا علمبردار تھا
وہ کہ باطل سے مسلسل برسرِ پیکار تھا

کوئی ہٹ دھرمی پہ آ جائے تو اس کا کیا علاج
سچ کو دانستہ جو جھٹلائے تو اس کا کیا علاج
بے وفائی پہ اتر آئے تو اس کا کیا علاج
اپنے محسن کو بھلا جائے تو اس کا کیا علاج

ورنہ ایسا کون تھا اسوقت جوہر کے سوا
اپنا سب کچھ جو وطن کی راہ پر کرتا فدا

جنگ آزادی کے ہم کو سارے رہبر یاد ہیں
بوس گاندھی اور آزاد و جواہر یاد ہیں

چاہے وہ برتر رہے ہوں یا ہوا کمتر یاد ہیں
جسقدر جذبات ہیں ان کی برابر یاد ہیں

یاد جوہر ہے جو ذہنی عصبیت کا ہے شکار
وقت کے بازیگروں کی مصلحت کا ہے شکار

آئے دن یوم ولادت جنم دن اور برسیاں
اس تعلق سے بہت مشہور ہے ہندوستاں

بھول بیٹھے ہیں مگر جوہر کی وہ قربانیاں
ثبت ہیں تاریخ کے صفحات پر جن کے نشاں

جرم ہے یہ اک صریحاً کہہ رہا ہوں صاف صاف
آنے والا وقت جس کو کر نہ پائے گا معاف

یاد جوہر کے تعلق سے یہ خاموشی ہے کیوں
یا بعنوان دگر یہ خود فراموشی ہے کیوں

یہ نشہ کیسا ہے آخر یہ کیسی مدہوشی ہے کیوں
رہبری ہے دوش تو جوہر ہی اک دوشی ہے کیوں

چھوٹی ہم سے کوئی تقریب نمائش تو نہیں
یہ خموشی کوئی سوچی سمجھی سازش تو نہیں

•••••●••••

عقل کی مرضی تھی کہ محمد علی انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی خوشی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انھیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے انکے لئے جج کا چغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتا اور رنج کا احرام بنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور انگرسال کے زمرہ شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ اویس و بلال رضؓ کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ غرض کہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتویٰ کہ شہید ہوں۔

اس کشمکش سے بالآخر عشق ہی کامیاب ہوا

(میر محفوظ علی)

یوسف راز
نعل صاحب چوک گانجہ کھیت ناگپور

محمد علی جوہر — قطرے سے گہر ہونے تک

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ایک عظیم المرتبت سیاست داں، مدبر، شاعر، ادیب صحافی اور شعلہ مقال مقرر کی حیثیت سے ایک ایسی معتبر اور تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے جن کا متعلق میر کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مولانا محمد علی کی ذات میں جو خوبیاں بیک وقت موجود تھیں ان میں سے کوئی ایک وصف بھی کسی شخص کی دائمی شہرت کے لئے کافی ہوتا۔

مولانا محمد علی کے جد امجد علی بخش خاں نجیب آباد میں پیدا ہوئے اور تقریباً ساری عمر نواب شود خاں کی خدمت میں گذار دی۔ علی بخش خاں کے ایک لڑکے (مولانا) عبد العلی خاں کو نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ ریاست رام پور نے اپنے مقربین کے زمرے میں شامل کر لیا۔ مولانا عبد العلی کی ریاست رام پور میں کافی قدر و منزلت ہوتی۔ مولانا عبد العلی کے تین لڑکے ہوئے۔ ذوالفقار علی، شوکت علی اور محمد علی۔

مولانا محمد علی نے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء میں اس جہان رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔ زندگی کی دو ہی بہاریں دیکھی تھیں کہ ۲ اگست ۱۸۸۰ء کو والد محترم مولانا عبد العلی خاں بعارضۂ ہیضہ انتقال کر گئے تینوں بچوں کی تربیت و پرورش کا بار گراں، ان کی والدہ ماجدہ "بی اماں" کے نازک کاندھوں پر آ پڑا۔ بی اماں نے جس دلچسپی اور دلسوزی کے ساتھ اپنے بچوں کی تربیت کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

۱۸۹۰ء میں محمد علی کو علی گڑھ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ۱۸۹۴ء میں انٹرنس کا امتحان اور بعد ازاں علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۸۹۸ء میں بی۔ اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ "بی اماں" کو بچوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دلانے کی زبردست خواہش تھی۔ چنانچہ انھوں نے محمد علی کو ستمبر ۱۸۹۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ کر دیا۔ انگلستان میں محمد علی نے آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں تمام اساتذہ اور طلباء محمد علی کی ذہانت اور قابلیت کے معترف تھے۔ انھوں نے آئی سی ایس کے امتحان میں داخلہ لیا لیکن امتحان میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی میں

مولانا محمد علی کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ انھیں ناانصافی کی وجہ سے ناکام ہونا پڑا۔ جنوری سنہ [illegible]ء میں کچھ دنوں کے لئے مولانا وطن واپس ہوئے تو بی اماں نے انھیں رشتۂ ازدواج سے منسلک کر دیا۔ شادی کے بعد محمد علی پھر آکسفورڈ واپس گئے اور جولائی سنہ ۱۹۰۲ء میں امتیاز کے ساتھ امتحان میں کامیابی حاصل کی اور وطن کو مراجعت فرمائی۔

ہندوستان واپس آنے پر مولانا محمد علی ابتداً رام پور میں ڈائرکٹر تعلیمات اور ریاستی ہائی اسکول کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ریاست میں انھوں نے بہت سی تعلیمی اصلاحات نافذ کیں۔ لیکن ریاستی ماحول سے جلد ہی ان کا جی بھر گیا اور سنہ ۱۹۰۶ء میں ریاست رام پور کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر ریاست بڑودہ میں کمشنری کا عہدہ قبول کیا۔ تقریباً چھ سال تک وہ اپنے فرائض منصبی کو تندہی، خلوص اور محنت سے انجام دیتے رہے۔ اسی دوران آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی نے اس اجلاس میں شرکت کی اور ان کی پیش کردہ کئی تجاویز منظور ہوئیں۔ اسی اجلاس نے محمد علی کو ملک کے سیاسی مطلع پر ابھرنے کا راستہ دکھایا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کے چوتھے اجلاس منعقدہ ناگپور میں مولانا محمد علی نے اردو زبان کی حمایت میں ایک پرجوش تقریر کی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں انھوں نے بڑودہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور خود کو خدمت قوم کے لئے وقف کر دیا۔ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے انگریزی ہفتہ وار "کامریڈ" شائع کیا۔ "کامریڈ" کی تحریروں نے جہاں ارباب اقتدار کے ہوش پراگندہ کرنے شروع کئے وہیں مسلم لیگ کی حکمت عملی میں زبردست تبدیلی آئی اور حکومت نوازی کی پالیسی کو بدل کر اس نے خود مختار حکومت کا مطالبہ شروع کر دیا۔ دارالسلطنت کی منتقلی کے ساتھ ساتھ "کامریڈ" بھی کلکتہ کی بجائے دہلی سے شائع ہونے لگا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اردو روزنامہ "ہمدرد" کا اجرا کیا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں "کامریڈ" میں "چوائس آف ٹرکس" کے عنوان سے ایک نہایت ہی سخت اداریہ انگریزوں کے خلاف اور ترکوں کی حمایت میں لکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ "کامریڈ" اور "ہمدرد" دونوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ اور مولانا محمد شوکت علی دونوں بھائیوں کو پہلے نظر بند اور پھر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ چھ سال نظر بندی اور جیل میں مسلسل چار سال کی قید سخت کے بعد ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء کو جب علی برادران کو رہا کیا گیا تو مولانا محمد علی جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے جہاں انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی اور اپنی کوششوں سے ہندو مسلم اتحاد کی بناء پائیدار کرنے کا کام انجام دیا۔

امرتسر کانگریس کے اجلاس میں مولانا محمد علی نے ایک جوشیلی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کہتا ہوں اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر جیل چلے جانا چاہئے۔ مجھے دوبارہ اپنی عمر بھر کے لئے نظر بند ہونا چاہئے۔ مسٹر بسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے۔ مگر اس قسم کے مظالم کا

ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جانا چاہیئے ۔ جیسے کہ پنجاب میں ہوئے" (جلیان والا باغ کے واقعہ کی طرف اشارہ)

اسکے بعد مولانا تن من دھن کے ساتھ تحریک آزادی میں شریک ہو گئے ۔ وہ خلافت تحریک کے روح رواں بن گئے اور خلافت کا وفد لے کر انگلستان بھی گئے ۔ انھوں نے سب سے پہلے خلافت کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کو منظور کروا کر ملکی و قومی دھارے سے تحریک خلافت کو مکمل ہم آہنگی عطا کی ۔ اس سلسلے میں دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں انڈین نیشنل کانگریس کا مشہور تاریخی اجلاس قابل ذکر ہے ۔ خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی انھیں دنوں ناگپور میں منعقد ہوا ۔ یہ محمد علی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۔ سی آر داس نے تحریک عدم تعاون کا فیصلہ کیا ۔ کانگریس کے لبرل گروپ کو جو تجویز ترک موالات کا کٹر مخالف تھا ۔ مولانا محمد علی کی کوششوں نے بے اثر کر دیا ۔ اس تجویز کی منظوری دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی ۔ اس وقت تک محمد علی جناح اور دوسرے لبرل کانگریس میں شامل تھے ۔ مگر ناگپور کانگریس کے بعد ہمیشہ کے لئے انھوں نے اپنے لئے علیحدہ راستہ اختیار کر لیا ۔

ناگپور کانگریس کے بعد محمد علی، شوکت علی اور گاندھی جی نے پورے ملک کا دورہ کیا ۔ گاندھی جی نے تحریک خلافت کے پلڑے میں اپنا پورا وزن ڈال دیا تھا ۔ محمد علی شوکت علی تحریک عدم تعاون کے لئے لوگوں میں جوش و جذبہ اور بیداری پیدا کرتے رہے ۔ ہندو مسلم اتحاد کا ایک عدیم النظیر ماحول پیدا ہو گیا تھا ۔ بچے بچے کی زبان پر یہ مشہور گیت تھا ۔

بولیں یہ اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دیدے

غرض کہ گاندھی اور علی برادران کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عوام کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی اور انگریزوں کا ڈر ان کے دل سے کافور ہو گیا ۔ محمد علی کا یہی کارنامہ کیا کم ہے کہ انھوں نے برصغیر ہندوستان کے طول و عرض میں ایک عام بیداری کی لہر پیدا کر دی تھی ۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں مولانا کو فوج کو ورغلانے کے جرم میں گرفتار کر کے دو سال قید با مشقت کی سزا دی گئی ۔ اسی زمانے میں ملک کے طول و عرض میں کراچی کے اس مقدمہ کی بازگشت سنائی دی اور مندرجہ ذیل نظم بچے بچے کی زبان پر از بر ہو گئی ۔ ؎

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی

ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

اسی زمانہ میں اماں بی اور بیگم محمد علی نے ملک بھر کا طوفانی دورہ کر کے رائے عامہ کو بیدار کیا تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت نے ملک میں ایک آگ سی لگا دی تھی ۔ انگریز گھبرائے ہوئے تھے کہ چوری چورا کا منحوس واقعہ پیش آیا ۔ گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک واپس لینے کا اعلان کر دیا ۱۹۲۲

[redacted]

میں گاندھی جی اور دوسرے رہنمایان تحریک آزادی کو گرفتار کر لیا گیا۔ حالات نے یکایک پلٹا کھایا اور ہندو مسلم اتحاد کی عدیم النظیر فضا میں اختلافات اور منافقت کے دھماکے ہونے لگے۔ شدھی سنگٹھن اور تبلیغ کی تحریکوں نے آزادی کے نصب العین سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر انھیں فروعی جھگڑوں میں الجھا دیا۔ انگریزوں نے بھی ان اختلافات کو خوب ہوا دی۔

انھیں غیر معمولی حالات میں معیاد سزا کی تکمیل کے بعد اگست ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی کو رہائی نصیب ہوئی۔ اسی رہائی کے بعد محمد علی نے پریس کے نمائندوں کو بیان دیتے کہا تھا کہ۔

"میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیل خانہ میں آگیا ہوں"

اسی سال انھیں انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس زمانہ میں کانگریس میں شدید اختلافات تھے۔ تبدیلی پسندوں اور غیر تبدیلی پسندوں میں ٹھنی ہوئی تھی۔ مولانا محمد علی نے غیر معمولی فراست اور دانائی کے ساتھ دونوں گروپوں کی تالیف قلب کا کام کیا اور تحریک آزادی کو آگے بڑھایا۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا۔ ان دونوں پرچوں کے ذریعے مولانا نے اس زمانے میں مطلع سیاست پر پیدا شدہ جمود و تعطل کی فضا کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے اپنی چالاکی سے ہندو مسلم اختلافات کی جو فضا پیدا کر دی تھی۔ مولانا کو اس سے بڑا دکھ تھا۔ انھوں نے ہر سطح پر فرقہ واریت کے عفریت سے مقابلہ کیا اور کوشش کرتے رہے کہ یہ زہر نہ پھیلنے پائے۔

۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کی طلب کردہ "موتمر عالم اسلامی" میں شرکت کے لئے مولانا حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے اپنی بے باکی اور جراءت و قوت ایمانی کا ثبوت دیا۔ ابن سعود کے اعلان ملوکیت کی سختی سے مخالفت کی اور خود ابن سعود پر کڑی نکتہ چینی کی۔

حجاز سے واپسی کے بعد مولانا دوبارہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کرتے رہے۔ انھوں نے کئی یونٹی کانفرنسیں کروائیں چنانچہ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے آل پارٹیز کانفرنس بلوائی۔ مگر محمد علی کو اپنی ان تمام مساعی میں شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ نہرو رپورٹ میں مکمل آزادی کے نصب العین سے کھلے انحراف کو مولانا کی حریت پسند طبیعت برداشت نہ کر سکی اور جب مولانا کی تمام ممکنہ کوششوں کے باوجود نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا گیا تو مولانا نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا۔

ملکی و ملی مشاغل اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے مولانا محمد علی اپنی ذات کی طرف [illegible] عدم [illegible] لاپرواہ ہوگئے تھے۔ شبانہ روز کی جسمانی و دماغی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جسم نے جواب دینا شروع کیا۔ ذیابیطس کے مرض میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوگیا تھا۔ قومی و ملکی حالات نے جو نئی کروٹیں لی تھیں اس نے انہیں بڑی حد تک دل برداشتہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن محمد علی کا جذبہ عمل بدستور تندرست و توانا تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۳۰ء میں انگریزوں نے لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا تو انھوں نے اپنی خطرناک

الت کے باوجود اس میں شرکت کی اور وہاں وہ تاریخی تقریر کی جو آزادیٔ ہند کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھی جائے گی۔ لندن کی اس گول میز کانفرنس میں بولتے ہوئے مولانا محمد علی نے ثابت کر دکھادیا کہ وہ انگریزوں کے احساس برتری سے قطعاً مرعوب نہ تھے اور خود اپنے سینے میں ایک مرد مومن کا دل رکھتے ہے۔ انھوں نے ببانگ دہل کہا کہ۔

”میں اور میرا بھائی پہلے اشخاص تھے جنھیں لارڈ ریڈنگ نے جیل بھیجا۔ مجھے اس معاملہ میں ن سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن میں بھی وہ بھی اختیار رچاہتا ہوں کہ جب لارڈ ریڈنگ ہندوستان میں کسی جرم کے مرتکب ہوں تو میں بھی انھیں جیل بھیج سکوں۔ میں آپ سے درجہ مستعمرات لینے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں ڈومینین اسٹیٹس کا قائل نہیں ہوں۔ میں کامل آزادی کے عقیدہ کا پابند ہوں“۔

اور اسی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اس شیر نے گرج کر کہا۔

”آج جس ایک مقصد کے لئے میں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤنگا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے مرنے کو ترجیح دونگا۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی“۔

اور اس پروانۂ شمع آزادی نے واقعی جان دے دی لیکن غلام ملک کو آنا پسند نہ کیا۔

لندن میں ہی حالت زیادہ خراب ہوگئی اور آخرکار ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں انتقال کیا۔ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو شام کے چھ بجے پیڈنگٹن ٹاؤن ہال میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور میت کو بیت المقدس لاکر ۲۴ جنوری کو سپرد خاک کیا گیا۔

خاک قدس اور ابآغوش تمنا در گرفت
رفعت در فردوس زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

گذارش

جواب طلب امور کے لئے مناسب ڈاک ٹکٹ روانہ کیجئے۔ غیر طلبیدہ مضامین اگر قابل اشاعت نہ ہوئے تو اسی صورت میں واپس ہونگے جب انکے ساتھ مناسب ڈاک ٹکٹ بھیجے جائیں جن حضرات کو اعزازی پرچے ارسال کئے جاتے ہیں براہ کرم وہ رسید سے نوازیں۔

قادر نیازی

دانائے راز محمد علی جوہر

"ـــــ کردار کی بلندی، صبور و شکور کی تصویر، عزم و استقلال کا پیکر اور یقین و عمل
ـــــ "جوہر" کے ہر گوشۂ حیات سے نمایاں ہے ۔
جوہر" جیسی شخصیتیں اپنی قوم کے لئے لازوال سرمایہ ہی نہیں ہوتیں بلکہ وہ ہر دور کے لئے ممکن کی زندگی ان سائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ مندرجہ ذیل نثری قطعات میں "جوہر کے" "جوہر حیات" کو تلاش کیجئے ۔

● مجھے کسی نے کچھ بھی نہیں دیا ہے ۔ مگر میں نے سب کچھ سب کچھ دیا ہے جو کہ میرے پاس تھا ۔ اس چاہت میں ـــــ میں نے اپنا سب کچھ سرمایہ جو کہ قدرت نے مجھے دیا تھا اپنے چاہنے والوں کے لئے بخشش کر دیا ہے ۔ مگر جب میں فرطِ مسرت سے ان کے سینوں سے لپٹ گیا ہوں تو مجھے "خلوص" کچھ بھی ملا

● جب میں راتوں میں روتا ہوں تو کیا ـــــ تم ۔ میری سسکیوں کو نہیں سنتے ۔ ان راتوں کو میں اپنے آنسوؤں سے روشن کرتا ہوں ۔ مگر تم سمجھتے ہو کہ میں ایک اندھیری کوٹھری میں جی رہا ہوں ـــــ کئی برسوں سے ۔

● جس نے مجھے پیدا کیا ہے ـــــ جواب طلبی پر میں اپنے خالق کو کیا جواب دونگا ـــــ خاموش کیوں ہو گئے ـــــ ۔

● میرے دوستو ! میرے یارو ـــــ اب مجھے کیوں یاد کرتے ہو ۔ میرا پیار ۔ میری محبت ـــــ کو اب تک تم بھولے نہیں ہو ـــــ نہ جانے کیوں ؟

● میں ایک مرمریں مجسمہ ہوں ۔ خلاق عالم نے اپنے بہترین لمحات میں مجھے تراشا ہے ۔ میری آنکھوں میں نمی ہے اور پلکوں پر ایک آنسو ٹھہرا ہوا ہے ـــــ درخشندہ اور تابناک ۔ میرے ہونٹوں پر ایک ارتعاش منجمد کر دیا گیا ہے اور میرے ہاتھوں میں ایک

چھین لی ہے۔ اور میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔

- میرے ہمدمو ——— میری گم شدہ اشیاء میں میرے دل کو بھی تلاش کرو۔

- ہم سب پروردگارِ عالم کے سامنے سربسجود ہیں۔ مگر میں تمہارے سینوں میں ——— تمہارے دل کی دھڑکنوں میں ایک لازوال چیز تلاش کر رہا ہوں۔

- میں ہمیشہ افتادہ زندگی کا شکار رہا ہوں مگر میں اپنی زندگی سے بہت کچھ سیکھا ہے ——— مر "کر" جینا "۔

- میں ایک طویل مدت کے بعد اپنے وطن لوٹ رہا ہوں تو تم سب کیوں اداس ہو گئے۔ مگر میں اپنے سینے میں تمہاری حرارت کو محسوس کرتا ہوں۔ تمہارا خلوص میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ہے اور تمہارا عزم میری آنکھوں سے نمایاں ہے۔ اور تمہاری محبت میری صندلی پیشانی پر منعکس ہے ...... آؤ ——— میرے ہمدمو۔ میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو ——— کیا میں تم سب کی امانت نہیں ہوں۔

- میں جب تیرے حضور حاضر ہو کر کھڑا رہونگا تو کیا میں تیری اس مسکراہٹ کو دیکھ سکونگا؟

پروفیسر مس زہرہ جبیں ایم اے (اردو۔ فارسی)
۳۶۱ شنکر نگر ناگپور

بی اماں مادرِ قوم

مہاتما گاندھی کے خوابوں کی تعبیر

"میں ایک نئی عورت کا تصور کرتا ہوں۔ معزز، صحت مند اور تب بھی حلیم، جو کہ ہمیں بہادر ۔۔۔ کے سلسلے کا ایک ایسا تحفہ دے سکے جیسا کہ ہندوستان ماضی میں ان پر فخر کرتا رہا ہے۔

"ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ ہی بچوں کی پیدائش کا ذمہ لیا جا سکتا ہے۔ بچے کے ۔۔۔ ز کے لمحے سے اسکی پیدائش تک، ماں کا کیا فرض ہوتا ہے کہ اُسے جاننا چاہیئے۔ اور وہ ماں جو ملک ۔۔۔ ذہین، صحت مند اور تربیت یافتہ بچے عطا کرتی ہے وہ یقیناً ملک کی خدمت کرتی ہے۔"

"میں نے ایسی مثالیں عورتوں کی نسل کے خواب دیکھے ہیں جو کہ ہندوستان کے لیے باعث ۔۔۔ ز اور اس کے مستقبل کی محافظ ہوں گی۔

"عورت مجسم قربانی ہوتی ہے۔ جب وہ کوئی کام صحیح جوش کے ساتھ کرتی ہے تو پہاڑوں ۔۔۔ بھی متحرک کر دیتی ہے۔

صنف نازک کے بارے میں یہ گاندھی جی کے اقوال، تصورات اور خواب ہیں اور ان کے ۔۔۔ ابوں کی تعبیر مجسم ہو کر انہیں اماں بی میں مل گئی۔ وہ "بی اماں" جن کا ذکر انہوں نے "ینگ انڈیا" ۔۔۔ اس طرح کیا ہے۔

"اگرچہ سن رسیدہ تھیں لیکن ان میں جوانوں جیسی طاقت تھی۔ انہوں نے خلافت اور سوراجیہ ۔۔۔ حصول کے لئے مسلسل سفر کیے۔ وہ اسلام کی کٹر پیرو تھیں اور ان کی ترقی ہندوستان کی آزادی ۔۔۔ منحصر سمجھتی تھی۔ اور ہندوستان کی آزادی انکے نزدیک کھدر اور ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی۔ ۔۔۔ لئے انہوں نے اتحاد کی زبردست کوششیں کیں جو ان کے نزدیک جزوِ ایمان تھیں۔

اور ۱۹۲۴ء ۱۲ ۔۔۔ نومبر درمیان شب ان کے انتقال پر مہاتما گاندھی نے یوں فرمایا۔

"یہ تصور بڑا کٹھن ہے کہ بی اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ کون بی اماں کی باوقار شخصیت ۔۔۔ اجتماعات اور ان کی آواز کی گونج سے ناواقف ہے۔ وہ بدیشی کپڑا ترک کر چکی تھیں اور مولانا ۔۔۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے وصیت کی تھی کہ انھیں کھدر میں دفنایا جائے۔ جب کبھی میں ان کے بستر ۔۔۔ انہوں نے ہمیشہ سوراجیہ اور اتحاد ہی کے بارے میں معلوم کیا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں

موت کی رات انکے قریب ہی تھا۔ میں اور سروجنی دیوی فوراً پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری ان کے معالج تھے۔ مولانا محمد علی رو رہے تھے۔ مگر شوکت علی خاموش تھے۔ وہ بہت ضبط کر رہے تھے۔ اور اللہ کا نام لے رہے تھے۔

خود گاندھی جی کے الفاظ میں یہ تھی گاندھی جی کے خواب کی تعبیر۔ یعنی مولانا محمد علی اور شوکت علی کی والدہ محترمہ۔ جو کہ اکثر رسالوں میں چھپنے والی ایک مشہور و معروف تصویر میں اپنے عظیم الشان لڑکوں کے درمیان بڑے تمکنت کے ساتھ بیٹھی نظر آتی ہیں۔ ایک باوقار۔ شاندار ہستی۔ سراپا نور الٰہی جنکے دونوں زانو دونوں لڑکوں نے اس طرح تھام رکھے ہیں کہ گویا رابندر ناتھ ٹیگور کے قول کے مطابق دنیا و مافیہا کو چھوڑ کر پھر سے آغوش مادر میں جانے کے لئے بے قرار ہوں۔

بی اماں کا نام آبادی بانو بیگم عبدالعلی تھا۔ ان کے پوتے اور پوتیاں انہیں بی اماں کہتے تھے۔ اس لئے وہ سارے ہندوستان کی بی اماں ہو گئیں۔ ان کے بیٹے انہیں لوا کہہ کر پکارتے تھے۔
بی اماں ۱۸۵۲ء میں امروہہ ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئیں۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان کا خاندان سنبھل چلا آیا۔ رام پور کے قیام کے دوران ان کے والد نے ان کی شادی عبدالعلی سے کر دی جو ریاست رام پور میں ملازم تھے۔ دونوں کے باہمی تعلقات خوشگوار رہے۔ لیکن اس زمانے کی شاہانہ فضول خرچیوں نے عبدالعلی کو مقروض کر دیا تھا۔ بی اماں نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنے زیورات رہن رکھ کر ان کی مشکلات کو حل کیا۔

۱۸۸۰ء میں عبدالعلی ہیضہ کی وبا میں مبتلا ہو کر بی اماں کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی بہادرانہ اور مستحکم طبیعت کا ثبوت اسی دوران میں ملا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ بہت تندہی سے اپنے بیمار بڑے لڑکے کی تیمارداری میں مصروف ہو گئیں۔ دیکھنے والے متحیر ہوئے تو انہوں نے کہا۔
"میں نے مرنے والے کے فرض کو ادا کر دیا ہے لیکن اب زندہ کے تئیں مجھے اپنی ذمہ داری نبھانی ہے
لوگوں نے سمجھا ہوگا کہ اُسے شوہر کے گذرنے کا کوئی غم نہ ہوا۔ لیکن ؎

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

بعد میں رشتہ دار انہیں عقد ثانی پر مجبور کرنے لگے۔ تو انہوں نے جواب دیا۔" میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں۔ پہلے میرا ایک خاوند تھا۔ اب تو چھ ہیں" ان کا مطلب اپنے چھ بچوں سے تھا۔ انکا دیور چاہتا تھا کہ وہ اپنی کچھ جائیداد بیچ دیں۔ اُسے جواب ملا۔
"میں چاہتی ہوں کہ میرے بیٹوں کا مکمل حق ان تک پہنچے کہ وہ اپنی ماں کو یہ الزام نہ دے سکیں کہ وہ عورت ہونے کی وجہ سے جائیداد کا ٹھیک انتظام نہ کر سکی۔"

اس زمانے کی دنیاوی روایات سے انہوں نے بغاوت کی ۔ اپنے بڑے لڑکے ذوالفقار علی کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بریلی بھیجا کسی کے اعتراض کی پرواہ نہ کی اور بعد میں شوکت علی کو بھی وہیں تعلیم دلوائی ۔ بقول محمد علی ۔

"لوگ کہا کرتے تھے کہ کیسی ماں ہے کہ اسے اپنے بیٹوں سے ذرا محبت نہیں ہے جو انہیں اپنے سے جدا کئے دیتی ہے ۔"

چچا محمود علی نے (جو بی اماں کی جائیداد کے منتظم تھے) تعلیم کے اخراجات روک لئے تو بی اماں نے اپنے زیورات رہن رکھ لئے ۔ مجبوراً محمود علی خاں کو جھکنا پڑا اور شوکت علی ریاست رامپور کے پہلے گریجویٹ ہوئے ۔

پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں بھی انہوں نے بڑی ہمت اور جواں مردی کا ثبوت دیا جبکہ ان کے دونوں لڑکے نظر بند تھے ۔ وہ ہر طرف سفر کرتی رہیں ۔ کانفرنسوں میں شریک ہوتی رہیں ۔ خطوط لکھتی رہیں اور اس طرح آزادی کی تحریک کو اور مشتعل کر دیا ۔ بڑے بڑے مجمعوں میں بڑی دلسوز تقریریں کرتیں ۔ ہر سٹیشن پر لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی اور سب سے خطاب کرتیں ۔ انہوں نے اینی بسنٹ اور دوسرے بڑے بڑے مشاہیر کو خطوط لکھے ۔ مسٹر سبرامنیم آئر کو ۴ ستمبر ۱۹۱۷ء میں لکھا ۔

"اگر ایک ہوم رول کا جھنڈا زبردستی اتار دیا گیا تو اس کی جگہ ہزاروں نئے جھنڈے نہ بلند ہونگے ؟"

۳۰ ستمبر ۱۹۱۷ء میں کلکتہ کے اجلاس میں مسلم لیگ کو دیا ہوا پیغام ان کے عزم اور ہمت و استقامت و استقلال پر دال ہے ۔ ۔ ۔ "اگرچہ اس ضعیف و سن رسیدہ عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ولولہ اتنا کمزور نہیں کہ شوکت علی اور محمد علی کو جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے دے"

انکے سفروں کے دوران ہزاروں کا چندہ جمع ہو جاتا تھا ۔ انکی اس کامیابی سے حکومت بوکھلا گئی اور تشدد کا رویہ اختیار کیا لیکن بی اماں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی ۔ انہوں نے اپنی جدوجہد اور تقریروں کو اور بھی مزید کر دیا ۔ بمبئی میں انہوں نے بڑی پُر تاثیر تقریر کی ۔

"اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشانی کے عالم میں ہیں ۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں متحد رہیں ۔ کھدر پہنیں اور تمام دن لیڈر [illegible] ہیں ۔ ملک کے مفاد کے لیے دونوں کا اتحاد ضروری ہے ۔ تم کھدر کیوں نہیں پہنتے ؟ کیا [illegible] پہلے یہ کپڑے نہیں [illegible] ؟ کیا میں اس کھدر کو موٹا جھوٹا نہیں [illegible] زمانہ قدیم میں ہندو کھدر نہیں پہنتے تھے ؟ کیا [illegible] نہیں پہنا ؟ اس لئے میرے بھائیو [illegible] ہے کہ سیدھے راستے پر چلو اور ملک کے سپاہی بن جاؤ ۔ دلیر بن جاؤ ۔ خدا تمہیں عزت بخشے ۔"

رہائی کے بعد مولانا شوکت علی اور محمد علی نے انہیں اس محنت اور زحمت سے روکنا چاہا لیکن وہ نہ مانیں ۔ محمد علی لکھتے ہیں ۔

موت کی رات انکے قریب ہی تھا ۔ میں اور سروجنی دیوی فوراً پہنچ گئے تھے ۔ ڈاکٹر انصاری ان کے معالج تھے ۔ مولانا محمد علی رو رہے تھے ۔ مگر شوکت علی خاموش تھے ۔ وہ بہت ضبط کر رہے تھے ۔ اور اللہ کا نام لے رہے تھے ۔

خود گاندھی جی کے الفاظ میں یہ تھی گاندھی جی کے خواب کی تعبیر ۔ یعنی مولانا محمد علی اور شوکت علی کی والدہ محترمہ ۔ جو کہ اکثر رسالوں میں چھپنے والی ایک مشہور و معروف تصویر میں اپنے عظیم الشان لڑکوں کے درمیان بڑے تمکنت کے ساتھ بیٹھی نظر آتی ہیں ۔ ایک باوقار شاندار ہستی ۔ سراپا نور الٰہی جنکے دونوں زانو دونوں لڑکوں نے اس طرح تھام رکھے ہیں کہ گویا رابندر ناتھ ٹیگور کے قول کے مطابق دنیا و مافیہا کو چھوڑ کر پھر سے آغوش مادر میں جانے کے لئے بے قرار ہوں ۔

بی اماں کا نام آبادی بانو بیگم عبدالعلی تھا ۔ ان کے پوتے اور پوتیاں انہیں بی اماں کہتے تھے ۔ اس لئے وہ سارے ہندوستان کی بی اماں ہوگئیں ۔ ان کے بیٹے انہیں اماں کہہ کر پکارتے تھے ۔

بی اماں ۱۸۵۲ء میں امروہہ ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئیں ۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان کا خاندان سنبھل چلا آیا ۔ رام پور کے قیام کے دوران ان کے والد نے ان کی شادی عبدالعلی سے کر دی جو ریاست رام پور میں ملازم تھے ۔ دونوں کے باہمی تعلقات خوشگوار رہے ۔ لیکن اس زمانے کی شاہانہ فضول خرچیوں نے عبدالعلی کو مقروض کر دیا تھا ۔ بی اماں نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنے زیورات رہن رکھ کر ان کی مشکلات کو حل کیا ۔

۱۸۸۰ء میں عبدالعلی ہیضہ کی وبا میں مبتلا ہو کر بی اماں کو داغ مفارقت دے گئے ۔ ان کی بہادرانہ اور مستحکم طبیعت کا ثبوت اسی دوران میں ملا ۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ بہت تندہی سے اپنے بیمار بڑے لڑکے کی تیمارداری میں مصروف ہوگئیں ۔ دیکھنے والے متحیر ہوئے تو انہوں نے کہا ۔

"میں نے مرنے والے کے فرض کو ادا کر دیا ہے لیکن اب زندہ کے تئیں مجھے اپنی ذمہ داری نبھانی ہے"

لوگوں نے سمجھا ہوگا کہ انہیں شوہر کے گذرنے کا کوئی غم نہ ہوا ۔ لیکن ؎

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

بعد میں رشتہ دار انہیں عقد ثانی پر مجبور کرنے لگے تو انہوں نے جواب دیا "میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں ۔ پہلے میرا ایک خاوند تھا ۔ اب تو چھ ہیں" ان کا مطلب اپنے چھ بچوں سے تھا ۔ انکا دیور چاہتا تھا کہ وہ اپنی کچھ جائیداد بیچ دیں ۔ انہیں جواب ملا ۔

"میں چاہتی ہوں کہ میرے بیٹوں کا مکمل حق ان تک پہنچے کہ وہ اپنی ماں کو یہ الزام نہ دے سکیں کہ وہ ... کی وجہ سے جائیداد کا ٹھیک انتظام نہ کر سکی"

اس زمانے کی دقیانوسی روایات سے انہوں نے بغاوت کی ۔ اپنے بڑے لڑکے ذوالفقار علی کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بریلی بھیجا کسی کے اعتراض کی پرواہ نہ کی اور بعد میں شوکت علی کو بھی وہیں تعلیم دلوائی ۔ بقول محمد علی ۔

" لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ کیسی ماں ہے کہ اسے اپنے بیٹوں سے ذرا محبت نہیں ہے جو انہیں اپنے سے جدا کئے دیتی ہے ۔"

چچا محمود علی نے (بمبر دنی منتظم جائیداد) تعلیم کے اخراجات روک لئے تو بی اماں نے اپنے زیورات رہن رکھ لئے ۔ مجبوراً محمود علی خاں کو جھکنا پڑا اور شوکت علی ریاست رامپور کے پہلے گریجوئیٹ ہوئے ۔

پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں بھی انہوں نے بڑی ہمت اور جواں مردی کا ثبوت دیا جبکہ ان کے دونوں لڑکے نظر بند تھے ۔ وہ ہر طرف سفر کرتی رہیں ۔ کانفرنسوں میں شریک ہوتی رہیں ۔ خطوط لکھتی رہیں اور اس طرح آزادی کی تحریک کو اور مشتعل کر دیا ۔ بڑے بڑے مجمعوں میں بڑی دلسوز تقریریں کرتیں ۔ ہر اسٹیشن پر لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی اور سب سے خطاب کرتیں ۔ انہوں نے اینی بسنٹ اور دوسرے بڑے بڑے مشاہیر کو خطوط لکھے ۔ مسز سبز امینیم آئر کو ۴ ستمبر ۱۹۱۷ء میں لکھا ۔

" اگر ایک ہوم رول کا جھنڈا زبردستی اتار دیا گیا تو اس کی جگہ ہزاروں نئے جھنڈے نہ بلند ہونگے ؟"

۳۰ ستمبر ۱۹۱۷ء میں کلکتہ کے اجلاس میں مسلم لیگ کو دیا ہوا پیغام ان کے عزم اور ہمت واستقامت اور استقلال پر دال ہے ۔ ... " اگر چہ اس ضعیف وسن رسیدہ عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ولولہ اتنا کمزور نہیں کہ شوکت علی اور محمد علی کو جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے دے "

انکے سفروں کے دوران ہزاروں کا چندہ جمع ہو جاتا تھا ۔ انکی اس کامیابی سے حکومت بوکھلا گئی اور سخت رویہ اختیار کیا لیکن بی اماں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی ۔ انہوں نے اپنی جدوجہد اور تقریروں کو اور بھی شدید کر دیا ۔ بمبئی میں انہوں نے بڑی پر تاثیر تقریر کی ۔

" اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشانی کے عالم میں ہیں ۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں متحد رہیں ۔ کھدر پہنیں اور تمام دن کپڑا [illegible] نہیں ۔ ملک کے مفاد کے لئے دونوں کا اتحاد ضروری ہے ۔ آخر تم کھدر کیوں نہیں پہنتے ؟ کیا [illegible] پہلے بھی کپڑے نہیں [illegible] ؟ کیا میں اس کھدر کو موٹا جھوٹا نہیں [illegible] یا زمانہ قدیم میں ہندو کھدر نہیں پہنتے تھے ؟ کیا پیغمبر نے کھدر نہیں پہنا ؟ اس لئے میرے بھائیو ! [illegible] سمجھے کہ تم سیدھے راستے پر چلو اور ملک کے سپاہی بن جاؤ ۔ دلیر بن جاؤ خدا انہیں عزت بخشے ۔"

رہائی کے بعد مولانا شوکت علی اور محمد علی نے انہیں اس محنت اور زحمت سے روکنا چاہا لیکن وہ نہ مانیں ۔ محمد علی لکھتے ہیں ۔

بھائی صاحب نے منع بھی کیا کہ ہم لوگ آگئے ہیں اور پوری ہمت و معروفیت کے ساتھ کام کریں گے آپکو دن رات کے سفر اور دوروں کی ضرورت نہیں آپ آرام کیجئے اور مطمئن رہئے کہ ہم کوئی دقیقہ ملک و مذہب کی خدمت گذاری کا اٹھا نہ رکھیں گے ۔ مگر بی اماں نے نہ مانا اور فرمانے لگیں ۔ تو مجھ پر رشک کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک و قوم کی خدمت نہ کر سکے ۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ گھر میں پڑی رہوں اور ملک و مذہب کی کوئی خدمت نہ کروں

مجھے یاد ہے کہ تحریک خلافت کے دوران ان پڑھ بچے تک سڑکوں پر گاتے پھرا کرتے تھے ۔

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے اگر میرے سات بیٹے — کرتی انکو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ تھیں آزادی سے قبل کی بی اماں ۔ مادر قوم ۔ جنھوں نے اپنے دونوں قابل فخر بیٹوں کو آزادی کی لڑائی میں اطمینان کے ساتھ جھونک دیا اور خود بھی عملاً جنگ آزادی میں حصہ لے کر ثابت کر دکھایا کہ مسلمان عورت بھی جنگ آزادی میں کسی سے پیچھے نہیں ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بی اماں کی ہستی ایک ایسی عورت کی مثال تھی جس کے وجود سے تصویر کائنات رنگین نظر آتی ہے ۔ اور جس کی مشت خاک کا شرف میں ثریا سے بڑھکر ہوتی ہے

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سید سجاد حیدر بی اے علیگ — از پورٹ بلیر

"اس کشتۂ تغافل ملت کو اب یاد کیا جا رہا ہے ۔ اس کی زندگی میں اس پر بدگمانیاں تھیں ۔ طعنے تھے سرد مہری تھی مخالفت تھی ۔ اب ایک سیلاب عقیدت ہے کہ چاروں طرف سے امڈ آرہا ہے ۔ غالب کا شعر ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کسی پر اتنا صادق نہیں آتا ۔ جتنا کہ بے چارے محمد علی پر ۔ مرحوم میرا کالج فیلو ہی نہ تھا ۔ مجھے یہ فخر ہے کہ میرا کلاس فیلو بھی تھا ۔ اور وہ باوجود اس کے کہ دنیا کی بزرگ ترین ہستیوں میں شمار ہو تھا اپنے پرانے بیچ میرز کلاس فیلو سے آخر وقت تک اسی پرانے ارتباط اور بے تکلفی سے ملا کیا ۔ اب وہ مایۂ ناز کلاس فیلو کہاں ہے ۔

مولانا محمد علیؒ کا لکچر برلن میں

مُترجمہ ماسٹر محمد بخش صاحب مسلم بی۔ اے

ہندوستانی ایسوسی ایشن برلن کی استدعا پر مولانا محمد علی نے سیاسیات و مسائل حاضرہ پر ایک مبسوط تقریر ارشاد فرمائی۔ ہندوستانی مقیمان جرمن کے علاوہ متعدد جرمن (مرد و زن) اس جلسۂ سیاسی میں تشریف فرما تھے۔ جرائد برلن نے اس تقریر کو شائع کیا ہے جس کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں۔

مولانا نے فرمایا "ہندوستان میں تلک ایک ایسا آدمی تھا جو ہندوستان میں انقلاب پیدا کرنے کا مجاز اور حامی تھا۔ میں جب جیل سے رہا ہوا اس زبردست انقلاب پسند انسان نے مجھ سے کہا کہ ہندوستان کو جو اصلاحات دی گئی ہیں اسے وہ بنظر استحسان نہیں دیکھتا۔ لہذا ہندوستان انقلاب کے لیے برابر کوشاں رہے گا۔

ہندو مسلم اتحاد کے متعلق اظہار خیالات کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:-

ہندوستان میں ہندو اور مسلم اس طرح لڑ رہے ہیں جس طرح اہل فرانس اور اہل جرمنی میں چپقلش برپا ہے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا باعث ایک تیسری جماعت کی موجودگی ہے۔

ہندوستان ایک بہت بڑا جیل ہے جس میں ۳۲ کروڑ ہندوستانی قیدیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ان اسیران بلا کو یہ احساس نہیں کہ وہ جیل میں ہیں۔ گذشتہ چند سال میں باشندگان بھارت نو اسی جیل میں ٹھونس دئے گئے خطاب یافتہ اور اعلیٰ عہدیدار حضرات قید خانہ ہٰذا کے داروغہ ہیں جو ان قیدیوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ برطانوی تعلیم نے نوجوان ہندوستانیوں کے دل و دماغ کے اندر غلامانہ ذہنیت کے بیج بو رہے ہیں۔ اسیری کا عدم احساس اسی بیج کا ثمر تلخ ہے۔ گاندھی جی نے سلطنت برطانیہ کی جڑیں ہلا دیں۔ انھوں نے برطانوی قیصریت کا شکنجہ ڈھیلا کر دیا۔ اگر برطانوی قیصریت کو تباہ کرنا ہے تو اس کے لئے موزوں ترین ہندوستان ہی ہے۔ آزادیٔ ہند برطانوی قیصریت کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ ●

ماخوذ از رسالہ "اصلاح" لاہور
دسمبر ۱۹۲۸ء

خدائی کے مزے

"جس چیز کو میں ہندوستانیوں کے لئے، ہندوؤں یا پارسیوں کے لئے، مسلم سکھوں اور انگریزوں کے لئے، بندگان خدا کے لئے برا سمجھتا ہوں میں وہ آپ کی خدمت میں عرض نہ کرونگا۔ خدا کرے کہ ہم سب کلمۂ حق پر مجتمع ہو جائیں۔ میں اگر غلطی پر ہوں تو آپ میری رہنمائی فرمائیں اور اگر آپ غلطی پر ہونگے تو میں درست مشورہ دونگا۔ میں ایک رسی تو آپ کے گلے میں ڈالنا پسند کرونگا، باوجود مکمل آزادی کے دعوے کے میں آپ کو آزاد بنانا نہیں چاہتا۔ میں آپکو بندگی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی نظر بندی کے زمانے میں اپنے بڑے بھائی (ذوالفقار علی گوہر) کے جواب میں غزل لکھی تھی۔ وہ شاید حکومت پرستی کی وجہ سے ہم سے چھندواڑہ میں ملنے تک نہ آئے۔ میرا ان بھائی نے جو ہندوستان کے بے مثل شاعر ہیں ایک مطلع میں سب کا جواب دے دیا ہے

جور اعدا کے گلے تیری جدائی کے گلے   اس دل تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے

میں نے ردیف بدل کر اس قافیہ میں غزل لکھی تھی جس کا مطلع یہ تھا ہے

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے   خضر کیا جانے بھلا رہ نمائی کے مزے

پانچ سال کی مسلسل قید کو مد نظر رکھ کر بیتول جیل میں لکھا تھا ہے

کثرت شوق سے ہے ہجر بھی ہم رنگ وصال   ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری خدائی کے مزے
کثرت شوق تھی اور لذت بعد منزل   ہر طرف خار تھے اور رہنمائی کے مزے
طبع آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی   قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

اور جس شعر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا تھا جس کے سبب سے بیتول جیل مجلس ... بنا دی گئی تھی وہ یہ ہے ہے

میری مرضی ہوئی جب سے تیری مرضی میں گم
بندگی ہی میں ملے ہم کو خدائی کے مزے

میں آپ کو اسی بندگی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ساری خدائی کے مزے مل جائیں۔"

جوہر سنہ ۱۹۲۹ء

(خلافت کانفرنس کلکتہ کے صدارتی خطبہ سے)

محمد خضر حیات، ایم۔ اے۔ بی ایڈ

نقوش زنداں

(جوہر کی جیل کی تحریریں)

صیاد کیا ہوئی وہ تری خوئے احتیاط
مرغ خیال کے نہ مرے پر کتر گئی

جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر جدوجہد آزادی کے ایک ایسے مجاہد تھے جنہوں نے وطن عزیز کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کردیا۔ مگر اف تک نہ کی۔ محمد علی کا سا لیڈر ہندوستان میں شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ علی الخصوص غلام ہندوستان میں ان کی سی سیاسی بصیرت اور قومی و ملی محبت رکھنے والا رہنما ہمیں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ وہ ایک بہترین صحافی، صف اول کے مقرر، اچھے شاعر، اچھے ادیب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ انہوں نے آزادی کی لڑائی جی کھول کر لڑی۔ جو کھم لڑی اور برطانوی سامراج کی چولیں ہلا ڈالیں۔ تلک نے آزادی کی تحریک کو عوامی تحریک بنانے کے جس کام کا آغاز کیا تھا، محمد علی نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے ملک کے عوام کو بیدار کیا بلکہ تحریک آزادی کا غلغلہ ساری دنیا میں گونجا اور یہ گونج یہ غلغلہ محمد علی جوہر کی تنہا کوششوں کا براہ راست ثمر تھا۔ محمد علی جوہر نے تحریک آزادی ہند کے رشتے مخالف سامراج تحریک سے جوڑ دیئے۔ اور اپنی سیاسی بصیرت سے کام لے کر انہوں نے دنیا کے دانشمند طبقوں کی ہمدردیاں ہندوستان تحریک آزادی کے لئے حاصل کیں اور یہی ان کی سیاسی عظمت کا ثبوت ہے۔

تحریک آزادی کے دیگر مجاہدوں کی طرح علی برادران کو بھی قید و بند کی راہوں سے گزرنا پڑا۔ اوروں کی بہ نسبت بعض اوقات دونوں بھائیوں پر زیادہ سختیاں بھی کی گئیں۔ سامراج کی مخالفت میں سخت بھی دونوں اوروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی تھے۔

محمد علی جوہر کی قید و بند کی مجموعی مدت ۶ سال ۷ ماہ ۲۱ دن ہوتی ہے۔ پہلی بار انہیں ۲۲ اپریل ۱۹۱۵ء کو رام پور میں نظر بند کیا گیا۔ یہ نظر بندی اور اسیری تبدیلی مقامات کے

ساتھ (مہرولی، لینڈون، چھندواڑہ، بیتول) ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء تک جاری رہی اور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو انہیں بیتول میں رہا کیا گیا۔ اس پہلی اسیری کی کل مدت ۴ سال ۸ ماہ ۶ دن ہوتی ہے۔

دوسری بار مولانا محمد علی جوہر کو تحریک خلافت و ترک موالات کے طوفانی دور میں مدراس جاتے ہوئے والٹیر اسٹیشن پر ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کیا گیا اور مقدمہ کے لئے کراچی لے جایا گیا۔ وجہ گرفتاری مولانا محمد علی جوہر کی وہ معرکۃ الآرا صدارتی تقریر تھی جو انہوں نے خلافت کانفرنس منعقدہ کراچی میں کی تھی اور فتویٰ دیا تھا کہ مسلمانوں پر انگریزی افواج کی ملازمت حرام ہے۔ کراچی میں مولانا محمد علی اور دیگر مجاہدین آزادی پر مقدمہ چلا اور سب کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ کراچی سے مولانا کو بیجاپور جیل میں منتقل کیا گیا جہاں سے انہیں ۲۹ اگست ۱۹۲۳ء کو رہائی ملی۔ اس دوسری اسیری کی کل مدت ۱ سال ۱۱ ماہ ۱۵ دن ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کے زمانۂ اسیری کے خطوط، بیانات اور واردات سخن کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں ان کی حقیقی عظمت کا ادراک و احساس ہوتا ہے۔ قید و بند کی تکالیف اٹھاتے ہوئے بھی ان کا عزم و حوصلہ اسی طرح تابندہ و زندہ رہا اور انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی باطل کے سامنے سر جھکانے کا خیال دل میں نہ لایا۔ زمانۂ اسیری میں ان کی ملاقاتوں پر پابندی عائد کی گئی۔ خط و کتابت کو سنسر کیا گیا اور اسے گھریلو نجی معاملات تک محدود رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نظربندی برائے نام تھی حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں بدترین اسیری کی سزا دی گئی تھی۔ اس سزا کو محمد علی نے اپنے لئے جزا بنا لیا۔ آرام و مصائب کی راہوں سے انہوں نے محبوب حقیقی کے وصال کی سعی کی۔ ملک و قوم کی مجالس سے دور، احباب و اقارب سے جدا، گھر والوں سے الگ، قید فرنگ کی سختیاں جھیلتے ہوئے انہوں نے آئینۂ قلب و روح سے زنگ و غبار کو دور کیا اور معراج روحانی کی اعلیٰ منزلوں کو طے کرتے رہے۔

زمانۂ اسیری میں انہوں نے ارادہ کیا کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک کتاب لکھیں جس میں آپؐ کے اس پیغام کی تشریح بھی کریں جو آپؐ انسانیت کے لئے لائے تھے۔ لیکن وسائل کی کمی اور حوالے کی کتابوں کی نایابی نے انہیں اس مفید کام سے روک دیا۔ مولانا نے بعد ازاں سیرت النبی مؤلفہ شبلی نعمانی کا انگریزی ترجمہ کرنے کا خیال کیا مگر اسے بھی وہ کر نہ سکے۔

زمانۂ اسیری میں زیادہ تر مولانا کتب بینی کے شغل میں لگے رہتے تھے۔ اور اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے حاشیوں پر اپنی رائے ضرور تحریر کرتے تھے۔ بیجاپور جیل میں مولانا نے اپنی

خود نوشت سوانح حیات لکھنے کا کام شروع کیا۔ لیکن اسے بھی وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔ یہی کتاب بعد میں کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی تلخیص و ترجمہ رسالہ جامعہ کے محمد علی نمبر بابت ۱۰ اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے۔

نظر بندی اور اسیری کے زمانے میں محمد علی نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور اپنے پیرومرشد مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ کو جو خطوط لکھے ہیں، وہ سنسر کی پابندیوں کے باوجود اپنے اندر بعض دلچسپ اور سبق آموز اسرار و رموز رکھتے ہیں اور مولانا کے کردار اور بوقلمون شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

۳۰ مئی ۱۹۱۶ء کو چھندواڑہ سے اپنے پیرومرشد مولانا عبدالباریؒ کو ایک خط لکھا ہے، چونکہ خطوط پر پابندی تھی کہ نجی اور گھریلو ذاتی باتوں کے علاوہ سیاسی باتیں نہیں لکھ سکتے تھے، اس لئے صرف اپنی طبیعت کا حال تحریر کیا ہے اور اخیر میں لکھتے ہیں: ۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جو افواہیں حضور اقدس کے متعلق دشمنوں نے اڑائی تھیں ان کا نتیجہ سوائے ان کے خلجان کے کچھ نہ نکلا۔ یہ وہ ہوائی غبارے ہیں جو ہوا کا رخ اور اس کی تیزیٔ رفتار جانچنے کے لئے کبھی کبھی چھوڑ دیئے جاتے ہیں ان کا جواب وہی استقامت ہے جو ہر مسلمان کا شیوہ ہونا چاہئے۔ کاش ہم بھی حضور کی سی استقامت حاصل کرسکیں۔"

اس خط کے تحریر کردہ جملے مولانا کی قوت ایمانی، پیرومرشد سے اپنی ارادت و عقیدت اور جذبۂ حب اسلام کے مظہر ہیں۔

چھندواڑہ سے ہی ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو حسرت کے نام ایک طویل خط لکھتے ہیں، یہ خط اپنے مضمون کے لحاظ سے انتہائی دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں: ۔

"......... اس عرصہ میں برابر غم و غصہ کا شکار رہا۔ میں جو بڑے بڑے معاملات میں بھی آج کے عارضی فیصلوں کا قائل نہیں اور ان تمام ہنگاموں کو "سرکس" سے زیادہ نہیں سمجھتا ۸ اپریل کے فیصلہ پر کیا بندۂ دام فریب ہوں گا۔ مگر دوستوں کی موت اس زمانہ میں بھی جبکہ موت کا بازار گرم ہے دو چار آنسو بطور خراج کے وصول کر ہی لیتی ہے۔ اور ۸ اپریل کو۔۔۔ چند عزیز ترین دوست نذر اجل ہوگئے اسلئے

میرا غم وغصہ بے جا نہیں ۔۔ مگر موت جسمانی نہیں، اس لئے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ بہت سے مُردوں کو جن کی ہڈیوں تک کا بھی پتہ نہیں چلتا "علی احیاء" میں شامل کرتا ہوں۔ مگر ان جیتی جاگتی کٹھ پتلیوں کو جو قومی اسٹیج پر نچائی جاتی ہیں اور نچائی جا رہی ہیں مُردوں سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ موت ان کے جسموں کو نہیں آئی بلکہ ان کی روحوں کو ۔۔۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو ؎

محروم ہوں، مجبور ہوں بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزہ میرے لئے ہے "

کتنا لطیف طنز کیا ہے انہوں نے اپنے ان سیاسی مخالفین پر جو حکومت کی جبہ سائی کو ہی حاصلِ کائنات سمجھ رہے تھے۔ اسی خط میں آگے لکھتے ہیں: ۔

"۔۔۔۔۔۔ افسوس کہ احرار ۔۔۔۔۔۔ سے زیادہ ہمت والے نہ نکلے۔ اب انہی کی نہیں بلکہ خود حریت کی جگ ہنسائی ہو رہی ہے مگر اس کا زیادہ رنج نہیں رنج پرانے دوستوں کی رفاقت چھوٹنے کا ہے۔ غالب نے سچ لکھا تھا کہ ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

مگر اچھا یہ ہوا جھوٹا سہارا بھی گیا۔ اب ایک سہارا باقی ہے اور وہ ہمیشہ کافی تھا اور اب بھی ہے۔ غالب کی غزل کا ایک شعر پچھلے کئی برسوں سے دل میں کھب چکا ہے ؎

چاک مت کر جیب کو بے فصلِ گُل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیئے

اس پر ایک نامکمل غزل قافیہ کو محدود کر کے میں نے بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے ؎

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیئے

مگر لکھ کر تو لکھ گیا خود اب جا کر اس کا مفہوم سمجھا ہوں ۔۔۔۔۔

.... البتہ جب تمہارا خیال
آتا ہے اور تم سے بھی زیادہ بہن کا تو یہ بے اختیاری دور ہوتی ہے
اور جس طرح خدا سے میں مایوس نہیں ہوں اسی طرح اس کے بندوں
سے مایوسی بھی قریب کفر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ قومی اسٹیج کی کٹھ
پتلیاں نہیں ہیں وہی غریب اور کمزور لوگ ہیں جن سے اسلام کی ابتدا
ہوئی تھی۔ رہے یہ حضرات تو ان سے متعلق تو بدگمانی بہت پہلے سے
تھی چنانچہ میں نے متعدد بار ان "آزادوں"، کے مضمون کو غزلوں میں
باندھا مثلاً ؎

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد "

اسی خط میں مولانا حسرت موہانی کو کس مزے سے دادِ سخن دیتے ہیں، لکھتے ہیں:۔

"......... تمہارے دیوان پڑھ چکا اور نہایت غور سے پڑھے اور
بار بار پڑھے۔ ارتقائے سخن ظاہر ہے اب اگر یہ لکھتا ہوں کہ ؎
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ
تو اس کے صریح معنی یہ ہوئے کہ جو سختیاں الہ آباد، جھانسی، برہانپور
اور فیض آباد میں جھیلنا پڑیں ان سے زیادہ کا مستحق ہوں۔ مگر یہ
بھی تو جانتا ہوں کہ تم زیادہ کے بھی متحمل ہو گے اس لئے کہ وہ خود کسی
نفس پر اس کی سکت سے زیادہ تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالتا اور ؎
جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا ملتا ہے
غم و اندوہ کے لئے لکھا گیا ہے "

یہ خط جہاں جوہر کے طرزِ انشا، کی خصوصیات بتلاتا ہے، وہیں ہمیں اس سے مولانا کی
حسِ مزاح و طنز، شعر فہمی و شعر گوئی کی صلاحیتوں کے متعلق بھی پتہ چلتا ہے۔

بیتول سے مسعود علی ندوی کو خط لکھتے ہیں:۔

" سب کو سب کا سلام۔ اب نہ شوکت کی شکایت کی جا سکتی
ہے نہ تم کو شکایت باقی رہ سکتی ہے۔ ارے بھائی یہ من و تو کے جھگڑے
... ا ... باقی ... آنکھ ... ہے اور یکتائی۔ عیدین میں بھی ایک

امام اور دوسرا مقتدی ہے مؤذن بھی اور مکبّر بھی۔ یہی حال ہر جمعہ
اور ہر جماعت کا ہے۔ عیدین میں ایک دوسرے کو گلے لگا لیا گویا
ساری خدائی نے ساری خدائی سے عید لی لی "

جیل خانہ کراچی سے ۳۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انہوں نے ایک طویل خط اپنی مادرِ مہربان بی اماں کے نام تحریر کیا ہے۔ جس میں والٹیئر میں اپنی گرفتاری اور اس کے بعد کراچی لائے جانے کے واقعات بالتفصیل بیان کئے ہیں۔ ایک واقعہ اپنی تاثر انگیزی میں اپنی مثال آپ ہے '' اسے مولانا کی زبانی سنیئے:۔

" اسپیشل کی اطلاع کسی کو نہ تھی تاہم ریلوے والے چھوٹے چھوٹے
اسٹیشنوں پر واقف ہوگئے یوں تو خدا کے کرم سے ہندوستانی
بھائیوں کی محبت کے باعث ہم پر منوں پھول برسائے جا چکے ہیں
مگر ممالکِ متحدہ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جہاں گاڑی رکی
بھی نہیں اسٹیشن ماسٹر اور کلرک ہرے جھنڈے دکھاتے کھڑے
تھے۔ جب میری گاڑی (ڈبہ!) سامنے آئی تو ایک نے جھنڈے کے
نیچے سے پھول نکال کر اچھالے عمر بھر یہ پھول یاد رہیں گے "

مہاتما گاندھی کے نام ایک خط ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو کراچی جیل سے لکھا گیا جس میں مولانا نے مہاتما گاندھی کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے اہلیہ محمد علی کی قومی سرگرمیوں کی تعریف و توصیف کی ہے، لکھتے ہیں:۔

" پیارے باپو! ایک عرصے سے قدرتاً طبیعت کا تقاضا تھا کہ اب
آپ کو کچھ لکھوں لیکن بوجوہ چند در چند تاخیر ہوتی رہی۔ لیکن جب اخبارات
میں آپ کے قلم سے نکلی ہوئی بعض تحریریں میری اہلیہ کی تعریف میں ان
کارروائیوں کے متعلق جو وہ والٹیئر میں میری گرفتاری کے بعد کرتی رہی
ہے، پڑھیں تو مجھے مجبوراً آپ کو عریضہ لکھنا پڑا۔ میرے لئے ایک سطر کا
لکھنا بھی وقت طلب کام ہے جس کا آپ نے بھی خود علانیہ اعتراف
کیا ہے، مجھے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آپ نے مجھ پر کس قدر گہرا اثر
ڈالا ہے۔ غالباً میں نے ایک مرتبہ آپ سے کہا بھی تھا کہ ہم میاں بیوی
میں شادی سے قبل ہی عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہوگئی تھی اور یہ
ہندوستان میں ایک غیر معمولی بات ہے لیکن ہماری متاہل زندگی کے بعد ہم

ایک دوسرے سے ہر سال جدا رہے اس جدائی نے میری
اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لئے محبوب اور عزیز شریک زندگی
بنادیا ۔ اور گذشتہ عرصے میں جب میں نظربند تھا اس وقت
جو راہ اس نے اختیار کی تھی اس وقت سے ۱۹۱۹ء تک پُرخطر
زندگی میں تھی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ والٹیر کے پولس اسٹیشن پر
وہ میری نظروں میں جس قدر عزیز اور محبوب تھی اس سے پہلے وہ
میری نظروں میں نصف بھی نہ تھی ۔ وہ ریلوے پولس اسٹیشن میں
داخل ہوئی اور نہایت فراخدلی سے مجھ سے کہا کہ ہراساں نہ ہونا
میری اور بچوں کی فکر نہ کرنا مجھے الوداع کہہ رخصت ہوگئی اور
نہایت استقلال کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چلی گئی .....
.... سب سے زیادہ مسرت بخش میرے لئے
یہ بات تھی کہ آپ نے میری عزیز اور جاں باز اہلیہ کی تعریف کی ہے۔"

اس نسبتاً طویل اقتباس سے مولانا محمد علی جوہر کی متاہلانہ زندگی کے چند لطیف گوشے آشکارا ہوتے ہیں ۔ مذکرہ خط ایک طویل خط ہے جس میں مولانا نے گاندھی جی کو مقدمۂ کراچی کے متعلق تفصیلات سے آگاہ کیا ہے ۔

اس خط کے آخری جملہ میں مولانا نے ایک لطیف مزاح پیدا کیا ہے، لکھتے ہیں:۔
"میری والدہ اور اہلیہ کو مالی امداد کی ضرورت نہیں، ہم ایسے خطرناک
فقیر ہیں کہ اپنے مقصد کے لئے ہر چیز ہضم کر سکتے ہیں۔"

نظربندی اور اسیری کے دوران ہی مولانا محمد علی جوہر کو گاندھی جی سے یک گونہ عقیدت ہوگئی تھی اور اخیر تک انہوں نے باوجود سیاسی اختلاف کے ذاتی عقیدت واحترام میں فرق نہ آنے دیا اور تا عمر انہوں نے اس تعلق خاطر کو بہ حسن وخوبی نبھایا ۔

خطوط انسان کی دلی کیفیات اور باطنی جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے مولانا محمد علی جوہر کے خطوط زنداں سے ہمارے سامنے ان کی جو تصویر آتی ہے وہ ایک ایسا انسان ہے جس کا سینہ بے کینہ حب الوطنی کے پاکیزہ جذبات سے بھرپور ہے، جس کا دل حب نبی سے سرشار ہے اور جو جذبات اسلامی سے معمور ہے ، وہ ایک بے ریا، بلند حوصلہ، پاک دل و پاکباز انسان کی تصویر ہے جو محمد علی جوہر کی جیل کی تحریروں میں ہمیں نظر آتی ہے ۔

جہاں تک فکر شعر کا تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ جوہر کی شاعری کے جوہر قید وبند کی مصیبتوں کو جھیلتے ہوئے نکھرے اس میں داخلیت اور سوز وگداز کے ساتھ ساتھ جذبہ کی آمیزش قفس فرنگ کی طویل زندگی میں ہی پیدا ہوئی۔ اس لئے نامناسب تو نہیں ہے اگر اس جگہ ان کی شاعری بالخصوص اس کلام کے متعلق کچھ اشارے کئے جائیں جسے انہوں نے حالت اسیری میں تخلیق کیا تھا۔ حالانکہ یہ موضوع ایک الگ اور طویل مضمون کا متقاضی ہے، کیونکہ میں جوہر کو بنیادی طور پر شاعر تسلیم کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اگر وہ سیاست کی وادی پرخار میں نہ جا پڑتے تو آج یقیناً اردو کے ایک اچھے شاعر ہوتے۔ قید وبند کے مصائب نے ان کے فکر شعر کو جلا بخشی اور انہیں ایک صاحب فکر ونظر شاعر بنا دیا۔ بقول خود ان کے ؎

یہ نظر بندی تو نکلی رد سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جاکر کھلے
اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ
بال وپر نکلے قفس کے در کھلے

جب ان کی جواں سال شادی شدہ بچی آمنہ عارضہ دق میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئی اس وقت مولانا محمد علی جوہر قید فرنگ کی سختیاں جھیل رہے تھے اور اس حادثہ فاجعہ پر انہوں نے جو اشعار کہے ان میں دردمندی، حزن ملال اور ساتھ ہی تسلیم و رضا کی کیفیات ہیں جن کی وجہ سے اشعار میں شدت کا تاثر پیدا ہو گیا ہے

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

کون صاحب ذوق اردو داں ہے جس نے مولانا کی یہ غزل نہ پڑھی ہو اور اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اسوۂ یوسفی کی راہوں سے گذرنے کے بعد مولانا محمد علی جوہر

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

جیسی غزل کہنے پر قادر ہو سکے۔

آخر میں ایک دلچسپ موازنہ پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

۱۷-۱۹۱۶ء میں مولانا حسرت موہانی بھی جیل میں تھے۔ اور مولانا محمد علی جوہر بھی صیادِ فرنگ کے اسیر تھے۔ اسی زمانہ میں حسرت نے ایک غزل کہی تھی جس کے جواب میں جوہر نے بھی اسی ردیف و قافیہ میں غزل کہی تھی۔

حسرت کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

درس حق جاری ہے یاں بھی حسرت آزاد کا　　قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا

کامیابی پہ غضب نازاں ہیں ارباب ہوس　　ہر طرف اک شور برپا ہے مبارک باد کا

ٹوٹ جائے کیوں نہ ہمت عاشق ناکام کی　　جب نتیجہ کچھ نہ نکلے کوشش برباد کا

جلوۂ امید گویا درمیان فکر و یاس　　اک نمونہ ہے چراغ رہ گذر باد کا

لطف کی نوبت بھی آئے گی کبھی اے نازِ یار　　ختم بھی ہوگا کبھی یہ سلسلہ بیداد کا

شاہ جیلاں سے یہ حسرت عرض ہے اسلام کی　　یوں نہ ہونا چاہیئے تھا فیصلہ بغداد کا

اب جوہر کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

چند روزہ عیش ہے یہ جنت شداد کا　　فیصلہ ہرگز نہ ہوگا اس طرح بغداد کا

شورِ ماتم کے لئے تیار رکھ گوشِ مراد　　ہے سزا رحسن ہنگامہ مبارک باد کا

عزم عاشق ہے خود اپنی کامیابی کی دلیل　　نام بھی لینا نہ ہرگز کوشش برباد کا

نورِ حق وہ شمع انور جو بجھ سکتی نہیں　　ہے خدا حافظ چراغ رہ گذر باد کا

آج تک ہے ایک کنعاں ہی کی شہرت مصر کی　　فیض سے حسرت کے ہوگا نام فیض آباد کا

ہو گئے جوہر یہ کیسے بندۂ دام فریب　　شور سنتے تھے بہت ہم حسرت آزاد کا

حسرت کی غزل حسرت و یاس کی غماز ہے تو جوہر کی غزل جوہر عزم و یقین سے مزین ہے۔

•••••

جمال الدین برق
مومن پورہ، ناگپور

مولانا محمد علی جوہر ناگپور میں

ہندوستان کی حصول آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں ناگپور کے اجلاس کانگریس منعقدہ ۱۹۲۰ء کو ہمیشہ نمایاں جگہ حاصل رہیگی۔ اس اجلاس میں وہ باغیانہ تجویز منظور ہوئی جس میں "سایۂ برطانیہ" کا جنازہ بڑے شدومد سے اٹھایا گیا۔ اس میں بھی مولانا محمد علی جوہر مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس جنازہ کو کاندھا دیا۔

اس وقت کانگریس کی پالیسی "ڈومینین اسٹیٹس" کی حامی تھی۔ اعتدال پسند کانگریس "سایۂ برطانیہ" کے آگے سوچنے اور چلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بمبئی پونا کے علاوہ بنگال کی ایک بہت بڑی جماعت دلیش بندھو سی۔ آر داس کی قیادت میں تبدیلیٔ عقیدہ کی مخالف تھی۔ دوسرے رہنمایانِ قوم ناگپور آچکے تھے۔ بنگال کی جماعت کی آمد آمد تھی۔ اور شہرت یہ تھی کہ بنگالی جماعت کامل آزادی کی تجویز کو ہرگز ہرگز منظور نہ ہونے دیگی۔ مسٹر داس اور مولانا محمد علی جوہر آکسفورڈ یونیورسٹی میں ساتھ پڑھ چکے تھے۔ دونوں کے آپسی تعلقات بہت اچھے تھے۔ اسی بناء پر داس کو ہموار کرنے کی ذمہ داری مولانا نے اپنے سر لی۔

مسٹر داس نے ناگپور ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا ہی تھا کہ مولانا پہنچ گئے اور ایک اثرانگیز جادو بھری تقریر کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلیش بندھو اپنی جماعت کے ساتھ کامل آزادی کی تجویز کے ہم نوا ہو گئے۔ کانگریس کے اجلاس میں تجویز آئی اور بھاری اکثریت سے منظور ہوئی۔ اعتدال پسند حضرات اور جاں نثارانِ حکومتِ برطانیہ ایک ایک کرکے کانگریس سے کنارہ کش ہو گئے۔

ناگپور کا یہ اجلاس اس لحاظ سے بھی تاریخی تھا کہ یہیں سے تحریکِ آزادیٔ ہند اور تحریکِ خلافت ایک ساتھ ایک ہی لیڈرشپ کے تحت آگئیں اور سارا دیش بلا لحاظ مذہب وملت

"جان بیٹا خلافت پہ دیدو"

کے نعروں سے گونجنے لگا۔

□

مرحوم نیاز فتح پوری

ماتم گلِ سرسبد

جنوری کا نگار شائع ہو چکا تھا کہ مولانا محمد علی کے واقعۂ ارتحال کی خبر ہندوستان آئی۔ صبح کا وقت تھا، میں بیٹھا ہوا بعض ضروری خطوط کا جواب لکھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں یہ صدا آئی اور میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مولانا محمد علی کیا چیز تھے، کن خصوصیات کے حامل تھے۔ انہوں نے ملک قوم کی کس قدر گرانمایہ خدمات انجام دیں، ان سب کا علم اخبارات کے ذریعے ان لوگوں کو بھی ہو چکا ہے جو ان سے واقف نہ تھے اس لئے میں ان کا اعادہ و تکرار مناسب نہیں سمجھتا اور یہ سطریں محض اس صدمہ کے اظہار میں لکھ رہا ہوں جو اس فقدان عظیم کی وجہ سے نہ صرف اسلامی ہند بلکہ سارے ہندوستان کو پہنچا ہے۔ مولانا محمد علی کی صحافی و رہنمایانہ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جسے ہندوستانی سیاسیات کے تار و پود سے علیحدہ کیا جا سکے۔ وہ ایثار و قربانی، حریت رائے، آزادی فکر، قوت عمل اور حب قوم کا مجسمہ تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ ثبوت ان کی وطن پرستی کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسی جذبہ کے ماتحت آخر کار انہوں نے جان ہی دے دی۔

اس میں شک نہیں کہ ہمیں ان کے بعض اصول کار سے اختلاف تھا۔ اور ہم کو یقین ہے کہ اگر وہ اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے (جن سے کوئی انسان خالی نہیں) اپنے جادۂ اولین سے انحراف نہ کرتے تو وہ ملک و قوم کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوتے۔ لیکن ان کے خلوص و صداقت کو ایک لمحہ کے لئے بھی مشتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے اگر ان سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہو تو ایک مجتہد کی غلطی کی طرح ثواب سے خالی نہیں ہو سکتی۔

مولانا مرحوم کی صحت و تندرستی ایک زمانہ سے خراب تھی اور ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ موت سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان کے مردانہ عزائم اور دلیرانہ جوش عمل میں کبھی کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ اور اپنی صحت و توانائی یا راحت و آسائش کی طرف فرض کی حد تک بھی کبھی توجہ نہیں ہوئی۔ اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے تو غالباً بیجا نہ ہوگا ـــــ اس لئے ہندوستان اس فقدان کے ساتھ اس صدمہ کو بھی کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ وطن پر فدا ہو جانے والی ہستی کی خاک سے بھی وطن کو محروم رکھا گیا۔ [illegible] کہ اعتقادی نقطۂ نظر سے بیت المقدس ان کے لئے بہترین

آرام گاہ ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ماننے میں تامل ہے کہ انہوں نے خود وصیت یہی کی تھی، یا تو ان کو وہیں یورپ
میں دفن ہونا چاہیے تھا تاکہ وہاں آزادئ ہند کی یادگار قائم ہوتی یا پھر آغوش ہند میں ان کی مٹی کو سپرد کرنا
چاہیے تھا جس کے لئے انہوں نے جان دی۔

خیر وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی یادگار ہو سکتی ہے
جس کو صحیح معنے میں مرحوم سے منسوب کیا جا سکے۔ اور اس کے قیام کے لئے ملک کس حد تک تیار ہے
ابھی تک اجتماعی حیثیت سے کوئی فیصلہ اس امر کا نہیں کیا گیا۔ اور اس لئے ابھی رائے زنی کا وقت نہیں
ہے لیکن جہاں تک ہماری خواہش کا تعلق ہے ہم اس یادگار کا قیام مادی و روحانی طریق پر دیکھنا
چاہتے ہیں، روحانی سے مراد کسی ایسی تحریک کی تاسیس ہے جو تربیت عقول و اذہان کے لحاظ
سے مرحوم کے مقصد زندگی کو پورا کرنے والی ہو۔ اور مادی سے مقصود کوئی ایسی تعمیر ہے جو بصیرت
کے علاوہ بصارت انسانی کو بھی ان کی یاد دلاتی رہے۔ امر اول کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ
جامعہ ملیہ دہلی سے متعلق ایک کلیہ محمد علی کے نام سے قائم کیا جائے اور امر دوم کی نسبت میری رائے
یہ ہے کہ اسی کلیہ میں مرحوم کا ایک مجسمہ قائم کیا جائے ......"

(ملاحظات' نگار فروری ۱۹۳۱ء)

ڈاکٹر غازی امان
تاج آباد، ناگپور

اردو صحافت اور جوہر

مولانا محمد علی جوہر کے مزاج کی سیمابیت، ذوق کی بلندی، شعر و سخن کا اعلیٰ مذاق اور ان کی شخصیت کی دلنوازی، ان کی بذلہ سنجی ان کی جذباتیت اور ان سب سے بڑھ کر ان کی سیرت کا نمایاں وصف ان کا بے لاگ جذبۂ حب الوطنی ہر اس شخص پر بخوبی واضح ہے جس نے سیرت محمد علی جوہر کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مولانا کی صحافت ان کی سیرت کی آئینہ دار تھی تو بیجا نہ ہوگا۔ وہی جذباتیت، سیمابیت، ادبیت اور جذبات وطنیت (جو جوہر کی سیرت کا جوہر تھے) ہیں ان کی صحافت کی نمایاں خوبیاں نظر آتی ہیں۔

مولانا محمد علی صحافت کے راستے سے سیاست کی وادیٔ پرخار میں داخل ہوئے تھے۔ اور انہوں نے صحافت کے ذریعے ہی سیاست کے رخ کو موڑنے کا کام کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اردو صحافت میں نئی روح پھونکی اور نیا سیاسی شعور اور قومی و ملی مسائل پہ نئی بصیرت عطا کی۔

اس سلسلے میں بیجا نہ ہوگا اگر یہاں محمد علی کا وہ نظریۂ صحافت پیش کر دیا جائے جو انہوں نے اپنے ایک شناسا کو اخبار نکالنے کے سلسلے میں مشورہ دیتے ہوئے پیش کیا تھا۔ جس زمانہ میں محمد علی بڑودہ میں ملازمت کر رہے تھے، ان کے ایک دوست نظام الدین نے گجرات سے ایک اخبار کا اجرار کرنا چاہا اور محمد علی سے مشورہ طلب کیا۔ محمد علی نے مشورہ کی صورت میں صحافت کے یہ زریں اصول ان کی خدمت میں پیش کئے۔

" اخبار کی کامیابی کے لئے اتنی باتوں کا ہونا لازمی ہے:۔

(۱) ذاتیات سے بالکل مبرا ہو، نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

(۲) کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے ذاتیات کا حصہ شامل نہ ہو۔

(۳) جو کچھ لکھا جائے عبار... آ[illegible] کہ خیال سے نہیں نہ لوگوں کو چٹکیاں لینے کی غرض سے

آرام گاہ ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ماننے میں تامل ہے کہ انہوں نے خود وصیت یہی کی تھی، یا تو ان کو وہیں یورپ میں دفن ہونا چاہیئے تھا تاکہ وہاں آزادیٔ ہند کی یادگار قائم ہوتی یا پھر آغوشِ ہند میں ان کی مٹی کو سپرد کرنا چاہیئے تھا جس کے لئے انہوں نے جان دی۔

خیر وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی یادگار ہو سکتی ہے جس کو صحیح معنے میں مرحوم سے منسوب کیا جا سکے۔ اور اس کے قیام کے لئے ملک کس حد تک تیار ہے۔ ابھی تک اجتماعی حیثیت سے کوئی فیصلہ اس امر کا نہیں کیا گیا۔ اور اس لئے ابھی رائے زنی کا وقت نہیں ہے لیکن جہاں تک ہماری خواہش کا تعلق ہے ہم اس یادگار کا قیام مادی و روحانی طریق پر دیکھنا چاہتے ہیں، روحانی سے مراد کسی ایسی تحریک کی تاسیس ہے جو تربیتِ عقول و اذہان کے لحاظ سے مرحوم کے مقصدِ زندگی کو پورا کرنے والی ہو۔ اور مادی سے مقصود کوئی ایسی تعمیر ہے جو بصیرت کے علاوہ بصارتِ انسانی کو بھی ان کی یاد دلاتی رہے۔ امرِ اول کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جامعہ ملیہ دہلی سے متعلق ایک کلیہ محمد علی کے نام سے قائم کیا جائے اور امرِ دوم کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ اسی کلیہ میں مرحوم کا ایک مجسمہ قائم کیا جائے ۔۔۔۔۔''

(ملاحظات ' نگار فروری ۱۹۳۱ء)

ڈاکٹر غازی امان
تاج آباد، ناگپور

اردو صحافت اور جوہر

مولانا محمد علی جوہر کے مزاج کی سیمابیت، ذوق کی بلندی، شعر وسخن کا اعلیٰ ذوق اور ان کی شخصیت کی دلنوازی، ان کی بذلہ سنجی، ان کی جذباتیت اور ان سب سے بڑھ کر ان کی سیرت کا نمایاں وصف ان کا بے لاگ جذبۂ حب الوطنی ہر اس شخص پر بخوبی واضح ہے جس نے سیرت محمد علی جوہر کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مولانا کی صحافت ان کی سیرت کی آئینہ دار تھی تو بیجا نہ ہوگا۔ وہی جذباتیت، سیمابیت، ادبیت اور جذبات وطنیت (جو جوہر کی سیرت کا جوہر تھے) ہمیں ان کی صحافت کی نمایاں خوبیاں نظر آتی ہیں۔

مولانا محمد علی صحافت کے راستے سے سیاست کی وادیٔ پُرخار میں داخل ہوئے تھے۔ اور انہوں نے صحافت کے ذریعے ہی سیاست کے رخ کو موڑنے کا کام کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اردو صحافت میں نئی روح پھونکی اور نیا سیاسی شعور اور قومی وملی مسائل پر نئی بصیرت عطا کی۔

اس سلسلے میں بیجا نہ ہوگا اگر یہاں محمد علی کا وہ نظریۂ صحافت پیش کر دیا جائے جو انہوں نے اپنے ایک شناسا کو اخبار نکالنے کے سلسلے میں مشورہ دیتے ہوئے پیش کیا تھا۔ جس زمانہ میں محمد علی بڑودہ میں ملازمت کر رہے تھے، ان کے ایک دوست نظام الدین نے گجرات سے ایک اخبار کا اجرا کرنا چاہا اور محمد علی سے مشورہ طلب کیا۔ محمد علی نے مشورہ کی صورت میں صحافت کے یہ زریں اصول ان کی خدمت میں پیش کئے۔

"اخبار کی کامیابی کے لئے اتنی باتوں کا ہونا لازمی ہے:۔

(۱) ذاتیات سے بالکل مبرا ہو، نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

(۲) کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے ذاتیات کا حصہ شامل نہ ہو۔

(۳) جو کچھ لکھا جائے عبا۔۔ آ۔۔ کے خیال سے نہیں نہ لوگوں کو چٹکیاں لینے کی غرض سے

بلکہ متانت اور نہایت سنجیدگی سے۔

(۴) جہاں تک ممکن ہو وہی خبریں چھاپی جائیں جو انگریزی ڈیلی چھاپتے ہیں۔ اگر اس سے زیادہ کوئی لوکل یا باہر کی خبر چھاپنی ہو تو ان کے راوی کا ثقہ ہونا سب سے ضروری ہے۔

(۵) اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہونا چاہئے نہ کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچانا۔ اس لئے دوسروں کے رنج پر اپنے کو خوش نہ ہونا چاہئے۔

(۶) اخبار خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے لہٰذا زیادہ تر خبروں کا حصہ ہونا چاہئے۔

(۷) مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو کسی ایسے مضمون پر جو اس زمانے میں زیر بحث ہو اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو، بلکہ ایسا ہو کہ جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا مضمون خواہ پولیٹیکل ہو خواہ سوشل خواہ تعلیمی خواہ تجارتی۔

(۸) ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہئے خواہ وہ کسی خبر کے متعلق ہو یا کسی مستقل مضمون پر۔

(۹) ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کے لئے ہیں اس لئے اسی کالم میں آنا چاہئے۔

(۱۰) مختلف مقامات پر چند مضمون نگار دوستوں یا تنخواہ داروں کا بندوبست کرنا چاہئے جو مہینہ میں ایک مرتبہ آدھے کالم میں آسکے۔

(۱۱) خطوط وہی چھاپے جائیں جو واقعی کسی ضرورت سے لکھے گئے ہوں نہ کہ نامہ نگاروں کی جودت طبع کے اظہار کے لئے۔

(۱۲) اخبار مذہبی بحث سے بالکل معرا و مبرا ہو۔

(۱۳) ایڈیٹر کو خود تمام مسئلوں پر غور کرنا اور دوسرے اخباروں اور کتابوں سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہے آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ روزانہ اخبار کا ایڈیٹر کس قدر سخت محنت کرتا ہے۔ خود مجھے مصر کے متعلق کچھ لکھنا ہے روزانہ اخبارات سے بہت سے واقعات معلوم ہوتے رہتے ہیں مگر تین چار کتابیں شروع سے آخر تک پڑھی ہیں تب جا کر ایک دو کالم کا مضمون لکھ سکوں گا۔ اگر قلم برداشتہ لکھنا چاہوں تو بہت آسان ہے مگر پڑھنے والے کو مشکل ہے۔"

(سیرت محمد علی از رئیس احمد جعفری ص۲۳۵،۲۳۶)

مولانا محمد علی نے متذکرہ بالا سطور میں صحافت کے جن رہنما اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ آج کل کی مشہور "زرد صحافت" سے بیزار تھے اور اردو صحافت میں پاکیزگی خیال اور صفائی تحریر کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے

خود صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو بڑے ہی اہتمام و انصرام کے ساتھ اور اپنے اعلیٰ ترین معیار کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے۔

انگریزی میں "کامریڈ" نے جو غیر معمولی شہرت حاصل کی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہی وہ ایک اعلیٰ درجہ کا اردو روزنامہ نکالنے کے لئے فکرمند تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے اردو روزنامہ اشد ضروری ہے۔ چنانچہ دہلی منتقل ہونے کے بعد انہوں نے اردو روزنامے کے اجراء کا اعلان کر دیا۔ روزنامہ کا نام ھمدرد تجویز ہوا اور جس پیمانہ پر اس کی اشاعت، طباعت اور ادارت کے انتظامات کئے گئے وہ بقول عبدالماجد دریابادی مرحوم "وہ اس زمانے میں اردو اخبارات کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھے" اور اب "ھمدرد" کے اجراء کے متعلق مولانا محمد علی کے اہتمام کی کہانی مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبانی ہی سنئے۔

"بدایوں کے ادیب جلیل میر محفوظ علی بی اے علیگ کسی زمانے میں محمد علی کے نیم استاد رہ چکے تھے۔ وہ اس وقت مالک و مدیر ھمدرد کے مشیر خاص تھے۔ ان ہی کے مشورے سے ایڈیٹری کے لئے پہلے تو مولوی عبدالحق صاحب بی اے سے مراسلت رہی لیکن پہلا تقرر اس عہدے پر اردو زبان کے نامور ادیب و ناول نویس مولانا عبدالحلیم شرر کا ہوا چنانچہ ستمبر میں شرر مرحوم دہلی روانہ ہو گئے۔"

محمد علی کا معیار پرچے کے ایڈیٹوریل اسٹاف اور لکھنے والوں ہی کے لئے اعلیٰ نہ تھا بلکہ کاغذ چھپائی، وغیرہ ظاہری لوازم کے اعتبار سے بھی وہ اردو کے ھمدرد کو اپنے انگریزی اخبار کامریڈ ہی کی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور کامریڈ ظاہری صفائی اور زینت کے اعتبار سے ولایت کے بہت روزہ جریدوں کا گویا ہم سطح تھا۔ چھپائی لیتھو کے بجائے ٹائپ کی ھمدرد کے لئے طے پائی۔ اور خوشنما ٹائپ کے لئے آرڈر بیروت اور مصر کو بھیجے گئے۔ قدرتاً وہاں سے آنے میں مہینوں کی دیر لگی۔ ٹائپ اور پریس کے الجھاوے جلد ختم ہونے والے نہ تھے۔ نتیجۃً ھمدرد تو جوں کا توں نکلتا رہا۔ اس روزنامہ کے صفحے کی ضخامت والا التوی ہی ہوتا چلا گیا اور ۱۹۱۲ء مدت ہوا ختم ہو چکا۔ کچھ روز بعد شرر صاحب بھی اکتا کر لکھنؤ واپس آ گئے۔

شرر صاحب کے بعد محمد علی کو ایڈیٹوریل صیغے کے لئے کسی نامی علمی اشخاص

بی اے مرادآبادی، سید جالب دہلوی مل گئے اور کچھ روز بعد محمد فاروق
ایم اے دیوانہ گورکھپوری بھی ہاتھ آگئے۔ جون ۱۹۱۳ء سے خدا خدا کر کے
ہمدرد نکلنے لگا اور اردو صحافت کی تاریخ میں ظاہری معنوی دونوں
حیثیتوں سے گویا ایک نیا باب کھل گیا۔"

ہمدرد صرف ایک روزنامہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک تحریک کا علمبردار تھا، خود ایک پیام تھا اور خود ایک مقصد، اردو صحافت میں ہمدرد نے جس طرز صحافت کا آغاز کیا اس کا تتبع دوسروں سے نہ ہو سکا۔ ہے لبِ ساقی پہ مکرر کن صلا میرے بعد!

ہمدرد کے مقالات، وقائع، اداریے، مراسلات، عالم اسلام سے متعلق تحقیقی اور تاریخی مضامین اور اس کے انداز بیان کی عالمانہ سنجیدگی اور اس کا وہ شریف وشستہ انداز تحریر اردو صحافت کے لئے ایک نقش پائیدار ہے جو مرور ایام کے باوجود آج بھی تازہ ہے۔

ہمدرد اردو کا وہ پہلا اردو روزنامہ تھا جس نے براہ راست ایسوسی ایٹیڈ پریس اور رائٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔

جب مولانا محمد علی جوہر کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے قید فرنگ کی صعوبتوں سے گذرنا پڑا تو مجبوراً ہمدرد ۱۰ اگست ۱۹۱۵ء کو بند کر دیا گیا۔ ہمدرد کا دوسرا دور ۸ نومبر ۱۹۲۴ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ دوسرے دور کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ اس دوسرے دور کے پرچے کی بھی وہی شان تھی جو پہلے دور کے ہمدرد کی تھی۔ سنئے مولانا دریابادی کی زبانی:۔

"اردو کے کسی روزنامہ میں اس وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی اور نہ قابلیت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا۔ غرض کچھ نہ ہونے پر بھی ہمدرد کا اسٹاف کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔ یہ بھی ٹھہری کہ مختلف مرکزی مقامات میں ہمدرد کے وقائع نگار خصوصی مقرر ہوں، چنانچہ لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ میں وقائع نگاروں کا تقرر ہوا۔ اور مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی کہ سیاسی، علمی، ادبی، مذہبی عنوانات پر اپنے ماہرانہ اور فاضلانہ مقالات سے وقتاً فوقتاً ناظرین ہمدرد کو مستفید کرتے رہیں۔"

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

محمد علی جوہر نے صحافت کو تجارت کے لئے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ قومی خدمت کے لئے انہوں نے صحافیانہ زندگی پسند کی تھی اس لئے ہمدرد یا کامریڈ دونوں سے ہمیشہ انہیں خسارہ ہی رہا اور مسلسل خساروں سے مجبور ہو کر بالآخر انہوں نے دونوں اخباروں کو بند کر دیا۔ ●●●

حضرت مولانا ناطق گلاوٹھوی مرحوم

غزل

حضرت مولانا ناطق گلاوٹھوی مرحوم کی حیات میں ناگپور کے ادب خیز، ادب نواز اور ادب ساز علاقہ کامٹی میں یوم جوہر کے سلسلے میں ایک طرحی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ مصرعۂ طرح جوہر کی غزل کے اس شعر سے لیا گیا تھا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

مولانائے موصوف نے بھی اس طرح پر غزل کہی تھی۔ برادرم عبدالحلیم صاحب کے شکریہ کے ساتھ ہم یہ نعمتِ گراں مایہ دے رہے ہیں

۔ مدیر ۔

سرمایۂ تسلیم و رضا میرے لئے ہے
قارون کی دولت میں نہ تھا میرے لئے ہے

میں دولتِ دارین کی پروا نہیں کرتا
معلوم ہے مجھ کو، کہ خدا میرے لئے ہے

ہے جام شریعت، مرے میخانے میں واعظ
ہر لغزشِ مستانہ روا میرے لئے ہے

صحرائے جنوں، خانہ خرابی سے نمٹ آؤں
چلتا ہوں بہت کام پڑا میرے لئے ہے

بدنام محبت ہوں، مصیبت میں پڑا ہوں
جب دیکھئے بہتان کھڑا میرے لئے ہے

گر خضر سر بالیں ہے، دوا کی کہ اجل کی
دیکھوں تو یہ کون آکے مرا میرے لئے ہے

غزل جوہر

غالب کا ایک شعر

چاک مت کر جیب بے ایام گل   کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

اکثر مولانا جوہر کے ورد زبان رہا کرتا تھا، اسی کی ردیف میں آپ نے غزل کے حسب ذیل اشعار موزوں فرمائے تھے

منشاء

صبر پہلی شرط غم خواری کی ہے
ضبط کا یاروں میں یارا چاہیے

تھک کے کہتا ہوں جنوں کیسا حجاب
خاک اڑانا آشکارا چاہیے

دشمنوں سے گر تلطف ہے تو کچھ
دوستوں سے بھی مدارا چاہیے

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیے



ڈاکٹر منشاءالرحمٰن خاں منشاؔ

غزل

[مولانا محمد علی جوہرؔ کی زمین میں]



ایک غم وہ بھی تمہارا چاہیئے
کچھ تو جینے کا سہارا چاہیئے

کون ہے جو آرزو پوری کرے
خرمنِ دل کو شرارا چاہیئے

میری قسمت کا سنورنا سہل ہے
تیری آنکھوں کا اشارا چاہیئے

دیکھ لی آسودگی بھی دیکھ لی
اب کناروں سے کنارا چاہیئے

جلوے خود کرتے ہیں نظروں کا طواف
ہاں مگر ذوقِ نظارا چاہیئے

ہم سا بننے کا اگر ارمان ہے
دل بھی پہلو میں ہمارا چاہیئے

منشاؔ لطفِ زندگی کے واسطے
شغل کچھ ہنگامہ آرا چاہیئے

بھولا بسرا ادب

یادش بخیر، انیسویں صدی کے اواخر میں اردو صحافت نے آنکھیں کھولیں، ہوش سنبھالا۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا تھا کہ برصغیر ہند و پاک میں اردو صحافت کا طوطی بولا کرتا تھا۔ سیاست ہو یا ادب، مذہب کے ہنگامے ہوں یا شعر و سخن کے معرکے، اردو کے رسائل و جرائد ہر موضوع و مضمون کو ملک گیر شہرت عطا کرنے کا سبب ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کی اولین دہائی میں ملک کے طول و عرض سے مختلف ادبی و نیم ادبی، سیاسی و مذہبی، فنی و سماجی موضوعات سے متعلق اخبارات و رسائل اردو میں شائع ہوا کرتے تھے۔ آج تقریباً پون صدی کا زمانہ گذرنے کے بعد جب ہم پلٹ کر اس ذخیرۂ ادب و شعر پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی بے پروائی سے کہئے یا یہ کہ روش زمانہ کے مطابق، ایسے بہت سے ادیبوں اور فن کاروں کو فراموش کر دیا ہے جو اپنے زمانے میں خاصی شہرت رکھتے تھے یا جنہوں نے واقعی طبعزاد تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو ادب کی ترقی کی رفتار تیز تر کر دی تھی۔ آج کے فراموش کردہ یہی ادیب و فن کار تھے جن کی کاوشوں کا نتیجہ اردو شعر و ادب کی ہمہ جہتی ترقی کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

اس سلسلے میں شعراء کچھ خوش نصیب واقع ہوئے ہیں کہ کسی نہ کسی صورت میں انہیں یاد کیا جاتا رہا ہے مگر نثری ادب کے فن کاروں میں بہت کم ادیب و نثر نگار ہمارے حافظے میں جگہ پا سکے ہیں۔ ایسے ہی بھولے بسرے ادیبوں کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے ہم مستقلاً اس "عنوان" کا اضافہ کر رہے ہیں اور جوہر نمبر کی مناسبت سے "ھمدرد" میں شائع شدہ ایک افسانہ "افسانۂ دل" اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ افسانہ اس وقت کے مشہور افسانہ نگار سلطان حیدر جوش کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور "ھمدرد" کی ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

-مدیر-

• سلطان حیدر جوش کے قلم سے •

افسانۂ دل

• چہار شنبہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء •

منظر کی، یعنی ان کے والد کی کوٹھی سے ملحق گوشۂ جنوب مغرب کی طرف، اس طرف جس طرف منظر کا کعبہ تھا، جس طرف سجدہ کرنے کی اسے آزادی حاصل تھی، وہی سرخ کوٹھی واقع تھی۔ جو منظر کی تمام آرزوؤں کا تمام مسرتوں کا بلکہ تمام زندگی کا مرجع کہی جا سکتی تھی۔ اس کوٹھی کے مالک ایک برہمو سماج بنگالی تھے جو عرصہ سے ایک عہدۂ جلیل پر ریاست مذکور میں نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سوائے اولاد کے اور کسی بات میں کمی نہ تھی۔ روپیہ پیسہ، عزت و حکومت، فارغ البالی اور عیش سب کچھ ضرورت سے زیادہ میسر تھا۔ البتہ اولاد کے نام سے سوائے ایک لڑکی کے اور کچھ نہ تھا۔

یہ لڑکی کلکتہ کے ایک بنگالی گرلز اسکول میں تعلیم پاتی تھی اور اسی سال انٹرنس میں کامیاب ہوئی تھی۔ منظر کے والدین میں اور اس بنگالی فیملی میں نہایت خصوصیت کا ربط ضبط تھا۔ منظر کے والد تعصب سے قطعی پاک تھے اور یہ بنگالی آزادی کے لحاظ سے بھی یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ برہمو سماج تھے۔

پورے آٹھ سال کی ہمسائیگی ایسی چیز نہیں جو ایک معتدبہ اثر نہ کرے پھر اس پر دونوں طرف اس قدر صاف مخالفت و تعصب کی کدورت سے پاک دل جس قدر بے تکلفی اور یگانگت پیدا ہو جاتی تھوڑی تھی۔ آج سے چھ سات برس بیشتر جب کہ یہ لڑکی — کملا — دنیا کو کسی قدر بھول اور نادانی آمیز نظروں سے دیکھتی تھی، منظر کی ہم نشیں، ہم جلیس اور شریک شرارت تھی۔ پھر زمانہ نے ان کو علیحدہ کر دیا۔ منظر علی گڈھ کالج میں بھیجے گئے اور کملا گرلز اسکول کلکتہ، بنگالی گرلز اسکول! خط و کتابت جاری رہنا کچھ تعجب انگیز نہ تھا اور ہر تعطیل کے موقع پر ایک دوسرے سے شوق کے ساتھ بنارس میں آکر ملنا قطعی نیچرل! مگر اس مرتبہ کچھ ایسا اتفاق ہوا تھا کہ پورے تین سال سے ملاقات نصیب نہیں ہو سکی۔ اس عرصہ میں منظر بھی کئی مرتبہ بنارس آئے اور کملا بھی، مگر اسے اتفاق کہیے یا فلک کج رفتار کی شعبدہ بازی جس دفعہ منظر آئے کملا نہ آسکی اور جس دفعہ وہ آئی منظر کالج نہ چھوڑ سکے۔

"پورے تین سال شوق و انتظار کے بعد آج مظہر عجیب بے چینی کے ساتھ کملا سے ملنے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ کچھ عرصہ سے ایک بنگالی سن رسیدہ عورت کملا کی نگراں یا اتالیق کی صورت میں اس کے پاس رہتی تھی۔ اور اسے ڈر تھا کہ کہیں اس وقت بھی یہ بدرنگی میں کاٹ لے جانے والا اتر پھ نہ لگا ہو۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ کملا فطرتاً شوخ طبع ہے اور اس کے متین نہ ہونے سے وہ اور اس کا شیدائی تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی کچھ کم شریر نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی خلقی بے باکی کبھی ہرگز نہیں جا سکتی اور اس بیباکی کی وجہ سے اور زیادہ خوش تھا کیونکہ وہ خود بھی تکلفات سے انتہا درجہ کا متنفر تھا۔

کملا جدید کی ایک کرسی پر بیٹھی کچھ بن رہی تھی، اور اس کی نازک انگلیوں میں تیزی کیساتھ حرکت کرنے والی سلائیاں اپنے کام میں مشغول تھیں۔ برابر والی آرام کرسی پر وہی سن رسیدہ بنگالی عورت ــ گرگ باراں دیدہ ــ عجیب طرح سے غافل تھی، اس کی ٹھوڑی سینہ پر جا لگی تھی، سفید سر جھک کر سامنے آ گیا تھا۔ ناک اور ٹھوڑی میں اس قدر کم بعد تھا جس قدر اس عمر میں اور صورت میں ــ منہ بالکل ویساتی لیٹر بکس کی طرح کھلا ہوا تھا اور سانس لوہار کے دھونکنے کی مانند برابر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کے آنے سے بیشتر نیند کی رہبری میں عدم آباد میں پہلے سے اپنے لئے کوئی جگہ تجویز کرنے گئی ہو۔

آہٹ کیساتھ کملا کی نظر اٹھی، اٹھی اور مظہر کی نظر سے ملی، ملی اور خدا جانے ایکدوسرے پر کیا اثر کر گئی، وہ خود بخود کھڑی ہوئی مگر جھجک سے گئی۔ از خود ایک تبسم پیدا ہوا مگر زبردستی روک دیا گیا۔ مظہر نے نہایت بے باکی اور شوق کے ساتھ ہاتھ بڑھایا اور اب کملا کا نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ مظہر نے کملا کا ہاتھ چھوڑے بغیر، کیونکہ اس ہاتھ سے ایک ناقابل بیان انجذاب موجزن تھا، کملا سے پوچھا۔

"یہ کون ہیں؟ شاید آپ کی اتالیق ہیں؟"

"ہاں! معلوم نہیں ہوشیار ہیں یا غافل!"

کملا کا جواب اگرچہ بظاہر بے تکا تھا، مگر در اصل معنی خیز تھا۔ مگر مظہر اس آسانی کے ساتھ متنبہ نہ ہو سکتا تھا، اس نے کہا

"میں ابھی معلوم کر سکتا ہوں"

"کیونکر؟"

"نہایت آسانی کے ساتھ۔ میں ابھی تم کو بتائے دیتا ہوں"

جواب دیتے ہوئے مظہر کملا کے کان کی طرف جھکا جس کے ساتھ ہی ایک بھولے پن سے کملا نے اپنا کان اس کی طرف بڑھا دیا۔ مگر بجائے اس کے کہ اس کی قوت سامعہ کچھ الفاظ سنتی، مظہر کے لب اس کے رخسار پر محسوس ہوئے اور ساتھ ہی ایک آواز کان تک پہنچی۔ کملا دفعتاً چونک پڑی، مظہر سے ہاتھ چھڑا کر ہٹ گئی۔ شرما گئی، وہ شوخ تھی۔ بے باک تھی۔ کلکتہ کی تعلیمیافتہ تھی مگر پھر بھی ہندوستانی تھی اور اب شباب کو محسوس کر رہی تھی۔ اور جو کچھ بھی ہو، اس بوسہ کی آواز کے ساتھ ہی سن رسیدہ عورت کی غفلت کا اندازہ ہو گیا۔ مردہ قالب میں یکایک جان سی پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر مظہر سے کرخت آواز میں پوچھا۔

"تم، کون ہو بابو؟"

"میں بابو نہیں ہوں۔ مظہر ہوں" مظہر شرارت سے ابھی دست کش نہیں ہوا تھا۔

"مظار ایس مظار۔ آج بڑا بابو تمہارا سب حال ام سے بولا تھا۔ ام تم کو جنٹلمین سمجھا تھا"

"اور میرے جنٹلمین ہونے میں اب شک ہے کیا"

"اوہ، یس! تم ابی کیا کیا؟"

"کچھ نہیں!!" مظہر اب تک بیباک تھا۔ مگر کملا؟ اس کا سانس کسی قدر معمول سے زیادہ سرعت کے ساتھ آ رہا تھا۔

"ابی ہم کھڈ سنا تم کیا کیا؟" "ام بڑے بابو سے جرور بولے گا"

"یہ کچھ نہیں تھا محض ایک بوسۂ ذومعنی تھا" شرارت آمیز متانت کیساتھ مظہر نے جواب دیا۔

"کیا؟.... کیا.. کیا تھا؟" بیچاری بنگالی عورت اس فارسی و عربی آمیز لفظ کا مطلب مطلق نہیں سمجھی۔

اس کا جواب دینے کے بجائے مظہر کرسی کی طرف جھکا اور اس سے بیشتر کہ وہ سن رسیدہ آگاہ ہو، زور کا بوسہ گرگ باراں دیدہ کی پیشانی کا لے لیا۔

"یہ کیا؟........ یہ ..... کیا ...؟" غصہ کے ساتھ بڑھیا کے منہ سے نکلا۔

مظہر:۔ (انگریزی میں) "تم اسقدر ناراض کیوں ہوتی ہو ہمارے کالج کا یہ طریقہ ہیکہ ہم جب کبھی برابر والے سے ملتے ہیں تو رخسار پر بوسہ دینا ہمارا فرض ہے اور کسی بزرگ سے ملیں تو پیشانی پر، اور اگر ایسا نہ کریں خصوصاً اس وقت جب کہ محبت دو میلان میں ہو تو سخت بدتہذیبی اور بدتمیزی سمجھی جائے گی"

"اچھا ویل! یہ بات! یہ بات!! تم ام کو ماف کرے گا۔ ام افسوس ہے"

اب بڑھیا کا غصہ رفو چکر ہو چکا تھا۔ بالکل اس طرح اڑ گیا تھا جس طرح گدھے کے سر سے سینگ! وہ بہت کچھ مظہر کی نسبت خصوصاً اس محبت کی نسبت جو مظہر اور کملا کے مابین تھی خود کملا کے والد سے سن چکی تھی۔ اس لئے اب زیادہ مخل ہونا اسے خود برا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اٹھی اور چلی گئی۔ مظہر بھی کملا کا ہاتھ ہاتھ میں لیکر (دبیتہ ہے)

درد و غم کتنے کیے جمع ......

مولانا محمد علی جوہر، اگر کچھ نہ ہوتے تو اردو کے بہت بڑے شاعر ہوتے، انگریزی کے عظیم ترین انشاپرداز ہوتے، لیکن وہ تو بہت کچھ تھے۔ اپنے وقت کی قومی و ملی زندگی کے "سب کچھ" تھے۔ لیکن وہ جو کچھ بھی رہے، جہاں کہیں بھی رہے ان کے اندر کا شاعر ہمیشہ زندہ رہا۔ اور غم حیات اور کشاکش روزگار سے اشعارِ آبدار کے موتی رولتا رہا۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ "ان کی روح مجاہد کی لیکن دل شاعر کا تھا" ذیل میں ہم ان کے اشعار کا انتخاب دے رہے ہیں تاکہ جوہر کی شخصیت کا یہ گوشہ ہمارے قارئین کے سامنے رہے۔

۱

خوفِ غمّاز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر — ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی
ربّ عزت کے لئے بھی کوئی رہنے دو خطاب — تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

۲

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے و لے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

۳

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
اسی شانِ امتیاز کو دیکھوں کہ اہلِ کفر — مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر

۴

یاد وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور — جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے — صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا — تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب — یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور
شاید کہ آج حسرت جوہر نکل گئی — اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

۵

کر گئی زندۂ جاوید ہمیں تیغ قاتل نے مسیحائی کی

۶

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

۷

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ہوسِ زیست ہے اس درجہ تو مرنا ہے یہی
اور کس وضع کی جویا ہیں عروسانِ بہشت ہیں کفن سُرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

۸

ایک ہی جام اور سرمستی ساقیا دیکھ میں چلا لینا

۹

نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے ذرا پر باندھنا صیاد کس کے

۱۰

سینہ ہمارا فگار دیکھئے کب تک رہے چشم یہ خوں نابہ بار دیکھئے کب تک رہے
یوں تو ہے ہر سو عیاں آمدِ فصلِ خزاں جور و جفا کی بہار دیکھئے کب تک رہے

۱۱

ہم کو خود شوقِ شہادت ہے گواہی کیسی فیصلہ کر بھی چکو مجرمِ اقراری کا
میری شہرت بھی اگر ہوگی تو کیا؟ قتل بھی کر نام ہو جائے گا تیری بھی ستمگاری کا

۱۲

ہوں لائقِ تعزیر یہ الزام ہے جھوٹا مجرم تو ہوں بیشک پہ خطا اور ہی کچھ ہے
خود خضر کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

۱۳

پھر ہو رہا ہے شورِ صلائے نبردِ عشق ہاں اے دہانِ زخم، جواب، الاماں نہ ہو
سنتے ہی جس کے خلق میں کہرام مچ گیا جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

۱۴

بیتاب کر رہی ہے تمنائے کربلا یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا

روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات — جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا
جوہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز — اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

15

دے نقد جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے — ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے ادھار دے
ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

16

ستم سے کچھ نہ ہوا اب کھلا ستم گر پر — ابھی کچھ اور بھی باقی ہے قتلِ عام کے بعد
تمہیں کرو سرِ تسلیم پہلے خم پئے قتل — کہ سر جھکاتے ہیں سب مقتدی امام کے بعد

17

مجھے تسکینِ دل پایا تجھے آرامِ جاں پایا — نہاں بھی ہے تو کیا تجھ کو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا
ہمیں ہر چیز میں آئی نظر یا رب ادا تیری — وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے تجھ کو بے نشاں پایا
ترا وہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے — اسی کو سرخرو دیکھا اسی کو کامراں پایا
نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پر اتنا ہے — کہ ہاں نام محمد مرتے دم وردِ زباں پایا

اور اب اخیر میں ایک پوری غزل ملاحظہ فرمائیے

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھئے — کب درِ میخانۂ کوثر کھلے
طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے — پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
چاک کر سینہ کو پہلو چیر ڈال — یوں ہی کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے
لو وہ آپہنچا جنوں کا قافلہ — پاؤں زخمی خاک منہ پر سر کھلے
ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا — رازِ فتحِ سبطِ پیغمبر کھلے
رونمائی کے لئے لایا ہوں جان — اب تو شاید چہرۂ انور کھلے
یہ نظر بندی تو نکلی ردِّ سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم — حق کے عقدے اب کہیں جا کر کھلے
اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش — معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

تعارف و تبصرہ

● — تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے — ●

ماہنامہ جامعہ: مولانا محمد علی جوہر نمبر

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون: عبداللطیف اعظمی

صفحات: ۲۱۶

اشاعت: اپریل ۱۹۷۹ء

قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

"جامعہ" اردو کا قدیم ادبی و علمی پرچہ ہے۔ جو گذشتہ پون صدی سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جو تعلق رہا ہے اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ اہل جامعہ جوہر کی یادگار میں سب سے پہلے نمبر شائع کرتے۔ لیکن دیر آید درست آید کے مصداق "جامعہ" کا زیر مطالعہ نمبر جوہر کی عبقری و نابغۃ المثال شخصیت کے شایان شان نظر آتا ہے۔

اس نمبر میں کل بیس مضامین اردو دنیا کے کہنہ مشق اور مشہور ادیبوں کے قلم سے جوہر کی زندگی کے مختلف گوشوں سے قاری کو روشناس کراتے ہیں۔ منظوم خراج عقیدت کے تحت ڈاکٹر مشار الرحمن خاں منشا، عمر انصاری اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی تخلیقات شامل ہیں۔ آخر میں محترم عبداللطیف اعظمی نے مولانا محمد علی جوہر پر چند کتابوں اور ادبی پرچوں کے خصوصی شماروں کا تعارف کرایا ہے۔ تصاویر کا حصہ بھی چند نایاب تصاویر اور "ہمدرد و کامریڈ" کے ٹائیٹل پیج کے عکس سے مزین نظر آتا ہے۔ جامعہ کے اس نمبر کے ٹائیٹل پر مولانا محمد علی کے آخری دور کی ایک کمیاب تصویر دی گئی ہے۔ کتابت و طباعت جامعہ کے معروف معیار کے مطابق ہی ہے۔

شذرات میں محترم ضیاء الحسن فاروقی نے کچھ فکر انگیز باتوں کو چھیڑا ہے خصوصاً ملیت اور قومیت کے متعلق مولانا محمد علی جوہر کے موقف پر جو اشارات فاروقی صاحب نے کئے ہیں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور اس طرح مولانا مرحوم پر بعض حلقوں کی طرف سے ملی عصبیت کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے اس کی خود صفائی اور تردید ہو جاتی ہے نیز قومیت اور ملیت کے

تعلق سے مولانا کا آنا اور صحت مند نظریہ جان کر ہمیں ان کی حقیقی فکری عظمت اور سیاسی دوررس اندیشی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

"مولانا محمد علی کی آپ بیتی" کا ترجمہ و تلخیص اس نمبر کا سب سے اہم مضمون ہے جسے عبداللطیف اعظمی نے مفید حاشیوں کے ساتھ اور زیادہ کام کا بنا دیا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، معین الدین حارث، رانا جنگ بہادر سنگھ، پروفیسر محمد مجیب جیسے اہل قلم اور صاحب علم حضرات کے تاثراتی مضامین، اپنے اندر معلومات کا خزانہ رکھتے ہیں۔ اور قاری کو جوہر کی شخصیت کے کئی مخفی گوشوں سے آشنا کراتے ہیں۔ ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا مضمون "محمد علی اور ابوالکلام" پہلی بار دو قد آور شخصیتوں کے باہمی تعلقات پر متوازن انداز سے روشنی ڈالتا ہے اور دونوں طرف سے کوری جذباتیت کے مرض متعدی سے پاک و صاف ہے۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کا مضمون "مولانا محمد علی اور علامہ سید سلیمان ندوی" کے عنوان سے ایک محققانہ مقالہ ہے جو پرچہ کے ص ۱۰۹ سے ص ۱۲۹ تک پھیلا ہوا ہے اور موضوع کے تعلق سے تمام گوشوں کو سمیٹا گیا ہے۔

مولانا محمد علی نے خودکشی کا ارادہ کیوں کبھی کیا تھا یہ چونکا دینے والی حقیقت ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضمون سے (جو اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔) ظاہر ہوتی ہے۔

اس نمبر کے دوسرے دلچسپ مضامین میں "مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی" (ڈاکٹر شرف الدین ساحل) جوہر ہند اور جوہری مصر (حکیم محمد حسین خاں شفا) تحریک خلافت کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر (نذیر الدین) شعلے کی سرگذشت (انور صدیقی) مولانا محمد علی کے خاندانی حالات (عتیق صدیقی) اور مولانا محمد علی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (عبداللطیف اعظمی) قابل ذکر ہیں۔

اس نمبر کے مطالعہ سے راقم الحروف کو کچھ جگہ غلطیاں نظر آئیں جو معمولی توجہ سے درست ہو سکتی تھیں۔ اور جن کا باقی رہنا علی الخصوص جامعہ کے محمد علی نمبر میں تحقیق کے آئندہ طالب علموں کے لئے فال نیک نہیں کہا جا سکتا۔

ص ۸۹ "... ۲۲ فروری ۱۹۱۳ء کو اردو اخبار ہمدرد جاری کیا گیا۔"

۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو "ہمدرد" نہیں بلکہ "نقیب ہمدرد" جاری کیا گیا تھا۔

اور اس کی بھی زیادہ صحیح تاریخ اجراء ۲۴ فروری ۱۹۱۳ء ہے۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ اسی صفحہ کے بالمقابل ہمدرد کے پہلے شمارہ کے ٹائٹل کا جو عکس شائع ہوا ہے اس میں ہمدرد کی تاریخ اشاعت یکم جون ۱۹۱۳ء درج ہے، جو یقیناً صحیح ہے۔

ص۸۴، ۲۵ اسی زمانہ میں ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور مچھلی بازار کی مسجد کا خونی حادثہ پیش آیا۔ مولانا محمد علی اس واقعہ سے تڑپ اٹھے اور سر جیمس مسٹن گورنر صوبہ متحدہ سے خط و کتابت کی۔

مسجد مچھلی بازار کے ایک حصہ کا انہدام یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو کیا گیا تھا۔

جس پر تمام مسلمانان ہندمیں اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ۳۰ اگست ۱۹۱۳ء کو مسلمانان کانپور نے اس حادثہ پر سخت احتجاج کیا اور برطانوی فوج کی گولیوں سے کئی مسلمان جام شہادت نوش کر گئے۔ مولانا محمد علی انہدام اور فائرنگ کے اس واقعہ سے بہت پہلے ہی مئی ۱۹۱۳ء سے ہی مسجد کانپور سے متعلق سر جیمس مسٹن سے خط و کتابت کر رہے تھے۔

ص۸۴، ۲۵ "چوائس آف دی ٹرک"، کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

ص۲۳، ۲۵ حاشیہ ۱۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے کامریڈ میں مولانا کا مشہور اداریہ "چوائس آف دی ٹرکس" شائع ہوا"

کون سی تاریخ صحیح ہے؟

ص۲۷، ۲۵ ۱۲ مئی ۱۹۱۵ء کو بعد نماز جمعہ علی برادران مہرولی کے لئے روانہ ہوگئے جہاں انہیں نظر بند کیا گیا تھا۔

ص۸۴، ۲۵ ۱۰ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا کو دہلی کے قریب مہرولی میں نظر بند کیا گیا۔

کون سی تاریخ صحیح ہے؟

ص۸۵، ۲۵ تقریباً پانچ سال کی نظر بندی کے بعد ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوگئے رہائی کے فوراً بعد ۲۹ دسمبر کو سیدھے امرتسر پہنچے"

مولانا کی رہائی ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو عمل میں آئی تھی۔ اور نظر بندی کی کل مدت ۴ سال ۸ ماہ ۶ دن ہوتی ہے۔

ص۸۶، ۲۵ مولانا محمد علی کی صدارت میں ۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو لاہور میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا"

جس اجلاس کا تذکرہ ہے وہ لاہور میں نہیں کراچی میں ہوا تھا۔ اور اسی بناء پر مولانا محمد علی جوہر پر مشہور مقدمہ کراچی قائم ہوا تھا۔ پروفیسر محمد مجیب نے مولانا محمد علی کا سن پیدائش ۱۸۷۹ء دیا ہے۔ مترجم اگر صحیح سن ولادت حاشیہ میں دیدیتے تو زیادہ مفید ہوتا۔ اسی طرح اسی مضمون میں مولانا محمد علی کی ریاست بڑودہ کی آٹھ سالہ ملازمت کا ذکر ہے جبکہ مولانا ۱۹۰۹ء

میں ریاست بڑودہ میں ملازم ہوئے اور ۱۹۱۳ء میں انہوں نے بڑودہ کی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اس بات کی وضاحت بھی حاشیہ میں ہو سکتی تھی۔

بحیثیت مجموعی جامعہ کا یہ نمبر صوری و معنوی خوبیوں کا ایک حسین مرقع ہے اور محمد علی جوہر کی ہمہ رنگ و ہمہ داں شخصیت پر ایک جامع دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

آوازۂ خلق

سوہن راہی۔ لندن :۔ ایجوکیشنل ٹائمز کا شمارہ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۹/۶ کو ملا، شکریہ۔ متعلقہ شمارے میں میری غزل شائع فرمانے کے لئے بھی شکریہ قبول فرمائیے۔ یہ شمارہ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ آپ اور آپ کے دوستوں نے یہ شمارہ بڑی محنت سے تیار کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حصۂ نظم اور نثر دونوں خوبصورت اور دلچسپ ہیں۔ خدائے برتر سے دعا ہے کہ وہ عوب کو خوب تر بنانے میں مددگار ثابت ہو، آمین۔

تاہم اس تحریر میں چند باتوں کی طرف آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں، امید کرتا ہوں کہ آپ بُرا نہیں منائیں گے۔ (۱) صفحہ ۲ پر آپ نے فہرستِ مضامین تحریر فرمایا جب کہ ساری تخلیقات مضامین نہیں ہیں بلکہ ان میں نظمیں، غزلیں اور دیگر ادبی شہ پارے بھی شامل ہیں۔ بہتر تھا کہ آپ "فہرستِ مضامین" کے بجائے ترتیب یا فہرستِ تخلیقات، وغیرہ لکھ دیتے۔

(۲) محترمہ ڈاکٹر زرینہ ثانی کے مقالے "ضیا فتح آبادی ــــ گیتوں کے آئینہ میں" صفحہ نمبر ۵ پر "براہ" اور صفحہ نمبر ۶ پر "دین" لکھا گیا ہے، میرے خیال میں "براہ" کی بجائے "برہ" یا "برہا" اور "دین" کی بجائے "دِین" آنا چاہئے تھا۔ یہ دونوں غلطیاں کتابت کی ہیں یا محترمہ زرینہ ثانی صاحبہ کی، یہ بات اب آپ لوگ جانیں۔ اسی مقالہ میں جب محترمہ ثانی صاحبہ "گیتوں کے اہم ستون" کی بات کرتی ہیں تو وہ آرزو لکھنوی کو سرے سے ہی نظر انداز کر جاتی ہیں۔

(۳) محترم عبدالرحیم نشتر کے افسانہ "قیدی" میں صفحہ نمبر ۱۶ پر "مور گرو فورڈ" لکھا گیا ہے، یہ ترتیب غلط ہے، صحیح ترتیب "گرو مور فورڈ" ہے۔ قیدی قابلِ تعریف افسانہ ہے اس کا انوکھے انداز میں لکھا جانا ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

فرید انصاری۔ ناگپور :۔ رسالہ موصول ہوا، غایت درجہ مشکور ہوں۔ تمام مضامین اردو ادب کی جان ہیں، جو خوب ہیں "منصوبہ اور کھنڈر" قابلِ تعریف ہے تب بھی "سالا اور سالے"

الفاظ کا استعمال اقبال کے مزاج پر گراں گزرتا ہے۔ ڈاکٹر ساحل صاحب کی غزل میں بیان کی سادگی سخن گوئی کے لئے نیک کوشش ہے، لیکن کلام کی اصلاح ضروری طور پر کروا لیا کریں۔

ربِ ایزدی سے دعا گو ہوں کہ آپ کی ادبی کاوشوں کو پروان چڑھائے۔

شریف اورنگ۔ ناگپور:۔ ایجوکیشنل ٹائمز کا بارہواں شمارہ ملا۔ جس میں تیرہویں شمارہ کا اعلان بھی ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔ اس لئے بھی کہ انہیں چند برسوں میں ناگپور، کامٹی کے زیادہ تر رسائل دم توڑ چکے ہیں۔ مجلس مشاورت کے ختم ہونے سے ٹائٹل ہی نہیں پرچہ بھی کافی اُجلا ہو گیا ہے۔ ایک بات ضرور کھٹکتی ہے اس شمارے میں بہنوں کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کم از کم ایک چوتھائی صفحات بہنوں کی ادبی تخلیقات کے لئے وقف ہونا چاہئے۔

دعا گو ہوں کہ ایجوکیشنل ٹائمز مضطر کی رہنمائی میں حیاتِ جاوداں پا جائے۔

محبوب راہی۔ آکولہ:۔ ایجوکیشنل ٹائمز کا تازہ شمارہ پیشِ نظر ہے اور میں تمام مشمولات سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد آپ کی صلاحیتوں پر انگشت بدنداں ہوں۔ اسباب کی کمی اور وسائل کے فقدان کے باوجود آپ نے اتنا خوبصورت، اس قدر دیدہ زیب اور ایسا عظیم الشان رسالہ نکال کر "جو ہو ذوقِ عمل پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں" کی صداقت کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ تمام مضامینِ نظم و نثر لاجواب ہیں۔ عزیزی نثار اختر انصاری کے ادبی لطائف میں چوتھا اور آخری لطیفہ بمبئی کے مسلم کالج کا نہیں بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرہ کا تھا اور وہ واقعہ اس طرح ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذہین اور شوخ و شنگ طلباء ہر سال مشاعرہ میں کسی ایک شاعر کو بلا امتیازِ مراتب 'ہوٹ' کرنے کے تعلق سے پہلے ہی طے کر لیتے تھے۔ اس سال ان کے تیروں کا ہدف مولانا امداد صابری کو بننا تھا۔ مولانا کے ایک عقیدت مند شاگرد نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا اور مشاعرہ میں نہ آنے کی درخواست کی، لیکن مولانا مشاعرہ میں شریک ہوئے اور جب ان کا نام پکارا گیا تو مائک پر پہنچتے ہی مؤدب ہو کر بیٹھ گئے اور انتہائی سنجیدہ لہجہ میں فرمایا کہ میں آج سرورِ کائنات ؐ کے حضور نذرانۂ نعت پیش کر رہا ہوں۔ تمام طلباء اپنے منصوبہ کی ناکامی پر کروٹیں بدلنے لگے۔ بالآخر نعت شریف میں جب مولانا امداد صابری نے ایک جوشیلا شعر پڑھا تو ایک لڑکے نے بلند آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کیا اور تمام میدان اللہ اکبر کی فلک شگاف آوازوں سے گونج اٹھا، پھر کیا تھا دیر تک نعروں کی یہ تکرار چلتی رہی اور مولانا کو مجبور ہو کر مائک سے ہٹنا پڑا۔

مولانا محمد علی کی یاد میں جوہر نمبر کا اعلان بڑے وقت کی چیز ہے، ایک نظم ارسالِ خدمت ہے پسند آ جائے تو شریکِ اشاعت کر لیجئے۔

طالب شادانی۔ امراؤتی:۔ [illegible] خط بعد میں پرچہ نظر نواز ہوئے۔ پرچہ کو بغور پڑھا۔ آپ کی اور آپ کے

جملہ ساتھیوں کی کاوش صد آفریں ہے بلکہ آپ نے زیست کے سمندر سے ایک ایک موتی چن چن کر شعراء اور ادباء کو یکجا کیا ہے جو اردو ادب کو زندہ رکھنے کے لئے تاحیات ضوفگن رہیں گے۔ جملہ مضامین اور منظومات کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کس کس کی تعریف کروں ہر ایک کے جچے تلے شمار کردہ، کے مصداق زبانِ قلم میں گویائی کی سکت نہیں رہی۔ دعا کرتا ہوں کہ بقول رواں صاحب۔

زندگی تو غمِ پیہم سے نکھرتی ہے رواں

زندگی کے تمام پہلوؤں کو غم کا لبادہ پہنا کر ہی اتنی خوبصورت بنائیے کہ رشکِ صد بہاراں ہو جائے۔ آمین

رسول اشرف۔ ناگپور:۔ ایجوکیشن ٹائمز کا نیا شمارہ جس نرالی تبدیلی کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے، وہ ادبی دنیا کے لئے نیک فال ہے۔ اگر پرچہ کو اور زیادہ ادبی بنانے کی کوشش کی جائے تو بہتر ہوگا۔ ادارہ کو پرچہ کی نوعیت تبدیلی پر مبارکباد۔

خورشید بیگم تابش۔ امراؤتی:۔ آپ کا خط اور پرچہ ایجوکیشن ٹائمز دونوں دستیاب ہوئے۔ لیکن چند وجوہات کی بنا پر جلد خط نہ لکھ سکی۔ معذرت خواہ ہوں، پرچہ دیکھ کر آپ کی محنت اور جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے ناسازگار حالات میں آپ نے ایجوکیشن ٹائمز کا اجرا کیا جبکہ معیاری رسائل کافور ثابت ہو رہے ہیں۔ ایجوکیشن ٹائمز کے جملہ مضامین نہایت عمدہ اور معیاری ہیں۔ غزلوں کا انتخاب بھی بہتر ہے۔ ایجوکیشن ٹائمز آپکی قوتِ فکر اور ذوقِ جمال کا بہترین ترجمان ہے۔

راج کھیتی۔ لندن:۔ ایجوکیشن ٹائمز کا گیارہواں شمارہ ملا۔ غزل کی اشاعت کے لئے دلی شکریہ، گیارہواں شمارہ معیاری اعتبار سے کافی خوبصورت ہے۔ تنقیدی مضامین اور بہترین شعری تخلیقات کو یکجا کرنے کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

پروفیسر مسز زہرہ جبین۔ ناگپور:۔ ایجوکیشن ٹائمز کے محمد علی جوہر نمبر کیلئے ایک مضمون "تعبیرِ خواب کی تمنا" ارسال ہے تقریروں کے اقتباسات "آج کل دہلی" سے لئے گئے ہیں، اگر ضروری ہو تو اب نوٹ لکھ دیں۔

عبدالرحیم نشتر۔ بھنڈارہ:۔ بھئی تم نے تو بالکل حیران کر دیا۔ اتنا شاندار پرچہ نکالو گے، اس کی امید نہ تھی۔ گیٹ اپ دیدہ زیب ہے، سرورق میں کچھ نہیں ہے پھر بھی جاذبیت کا حامل ہے۔ اس بار میٹر بھی عمدہ ہے اور کتابت و طباعت صاف ستھری۔ مجھے یقین ہے اس شمارے کی داد چاروں طرف سے موصول ہوگی۔

کامل بہزادی۔ بھوپال:۔ ایجوکیشن ٹائمز کا شمارہ نمبر ۱۲ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ ہر اعتبار سے بہتر ہے میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

بقیہ۔ افسانۂ دل ..... بانچھیں کھل گئیں۔ ہم کو کسی اور جھگڑے سے مطلب نہیں، اس سے بھی غرض نہیں کہ بڑھیا نے اس واقعہ کا ذکر بڑے میاں سے کیا یا نہیں یا "وہی ڈھاک کے تین پات" کے مصداق ایک نوجوان کے بوسہ نے اسے خاموش کر دیا۔ البتہ ہم کو صرف یہ الجھن ہے کہ "بوسہ خود معنی" کا اطلاق پہلے بوسہ پر ہو سکتا ہے یا دوسرے پر؟!

[ماخوذ علی برادران نمبر]

Regd NO.
R.N. 31864/76

THE EDUCATIONAL TIMES
NAGPUR
URDU QUARTERLY PAPER
IV Year of Publication—VOL-4 - issue -13-14

قادر نیازی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے انجمن ادب ہند کے لئے ... پرنٹنگ پریس ناگپور
میں چھپوا کر انجمن ادب ہند گانجہ کھیت ناگپور سے شائع کیا
ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ: ایجوکیشنل ٹائمز گانجہ کھیت ناگپور ۱۸